

منظف آباد کے قتل سے

# ایک مالکی پہنچی کھلتی

کرشنا مہتا

# ایک ماں کی سچی کہانی



کرشنا مہتا



مترجم: پروفیسر ایم اے آر کے خلیق



علم و شعور کا تابناک سفر  
حقیقت کے متلاشیوں کے لیے  
قدم قدم حقیقتیں



### جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

نام کتاب:	ایک ماں کی سچی کہانی
مصنفہ:	کرشنا مہتا
اردو ترجمہ:	پروفیسر ایم اے آر کے خلیق
اشاعت:	اکتوبر 2012ء
اہتمام اشاعت:	رائل انسٹی ٹیوٹ آف ساؤتھ ایشین آفئیرز برطانیہ
ڈسٹری بیوٹر:	نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر سٹڈیز (نکس) میرپور
	مکان نمبر 59 سیکٹر ایف-2 میرپور جموں کشمیر
قیمت:	200/= روپے

## انتساب

اکتوبر 1947ء کو مظفر آباد میں تعینات

وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر)

دو نی چند مہتا

کے نام

جس نے

قبائلی یلغار کے سامنے

سینہ سپر ہو کر

اپنے وطن عزیز ریاست جموں کشمیر

کی حفاظت کا عظیم فریضہ

سرا انجام دیتے ہوئے

جان قربان کر دی۔



## فہرست

5	محمد سعید اسعد	پیش لفظ	ا۔
8	محمد سعید اسعد	کرشنا مہتا (مختصر سوانحی خاکہ)	ب۔
11	پروفیسر ایم اے آر کے خلیق	تقریظ	ج۔
16		طوفان کے آثار	1۔
21		طوفان آگیا	2۔
28		آسمان سے گرا کھجور میں اڑکا	3۔
36		ایک بھائی کی قربانی	4۔
43		ضمیر لوٹ آتا ہے	5۔
51		اجتماعی خودکشی	6۔
56		اکلوتا شہید	7۔
61		ایک نتیجہ خیز انٹرویو	8۔
66		تباہ شدہ گھر میں	9۔
70		جنگ کے بادل	10۔
78		ایک اور شریف النفس	11۔
83		ایک اور وزیر کی زردال پذیری	12۔
90		نجومی	13۔
95		چمن لال کے گھر میں	14۔
102		ایک اور شہید	15۔
106		ایک دوست کی روانگی	16۔
112		سویرے سویرے کے ملاقاتی	17۔
117		الوداع مظفر آباد	18۔
121		کشمیری مسلمان	19۔
127		دوبارہ جیل میں	20۔
132		ڈراؤنا خواب	21۔
140		سوشل بائیکاٹ کا خوف	22۔
145		بالآخر ہندوستان روانگی	23۔
156		پنڈت نہرو کے ساتھ ایک انٹرویو	24۔

## پیش لفظ

ریاست جموں کشمیر صدیوں سے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کا مسکن رہی ہے۔ اس گلشنِ جنت نظیر میں ہر رنگ و بو اور تہذیب و تمدن کا پھول پروان چڑھتا اور نظر نواز ہوتا رہا ہے۔ ہندومت، بدھ مت، جین مت، اسلام، عیسائیت اور کچھ دھرم کے پیروکار اس خطہ کشمیر میں محبت، امن، بھائی چارے اور ہم آہنگی کی فضا میں ہی پروان چڑھے ہیں۔ دوسروں کے دین و دھرم کی روایات و اقدار کی پاسداری اور لحاظ اس معاشرت کا خاصا رہا ہے۔ مذہبی انتہا پسندی اور جنونیت کے لیے یہاں کی آب و ہوا قطعاً مناسب نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار ہا سال پر محیط اس خطے کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو تہذیبی تصادم اور مذہبی فسادات کی مثالیں نہیں ملتیں۔ مذہبی رواداری کے اعتبار سے ریاست جموں کشمیر کو ایشیاء میں ایک مثالی خطہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ریاست کے اڑوہس پڑوس میں واقع ملکیتیں ایسے مثالی خطے کبھی نہیں دیکھے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست جموں کشمیر میں امن، سکون، محبت، رواداری، بھائی چارے اور یگانگت کا ماحول پڑوسی طالع آزمائے ملکیتوں کو کھٹکتا رہا ہے اور وہ آئے روز ایسی سازشوں میں مصروف رہے ہیں کہ کب اور کس طرح اس خرمن امن پر کوئی چنگاری پھینک کر اس کو خاکستر کر دیں۔

ہزار ہا سال پر محیط ہماری تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ کشمیری معاشرہ میں دین و دھرم یا مذہب کے نام پر کبھی بھی ریاستی عوام باہم دست و گریبان نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے اپنے ملک کو کبھی مذہبی فسادات کی آگ میں جھونکا ہے۔ ایسا جب کبھی بھی ہوا اس میں بیرونی عناصر کا فرما نظر آتے ہیں۔ ریاست جموں کشمیر گزشتہ ساڑھے چار سو سال سے اس بد نصیبی کا شکار رہی ہے کہ اس کے پڑوسی ممالک نے اسے اپنے سامراجی مقاصد اور جارحانہ عزائم کے لیے تختہ مشق بنائے رکھا۔ یہ ریاستی عوام کی بھی نااہلی ہے کہ وہ اپنی ریاست کو بیرونی شریک اور امن دشمن عناصر کے اثر و رسوخ سے پاک نہیں کر سکے۔ بلکہ بسا اوقات ایسے مواقع پر عوام نے آؤ دیکھانے تاؤ وہ بیرونی حملہ آوروں کے شانہ بشانہ خود اپنے گھر کو آگ لگانے اور اپنے عوام کو تہ تیغ کروانے پر تیار ہو جاتے رہے۔

22 اکتوبر 1947ء ہماری قومی تاریخ کا ایک ایسا ہی سیاہ ترین اور غیر تاک دن ہے جب سرزمین



منظر آباد جو مختلف مذاہب کا گلدستہ تھی آناً فاناً قبائلی یلغار کا نشانہ بنی اور امن و محبت اور بھائی چارے کی فضا خوں آشام منظر پیش کرنے لگی۔ اگر لوگ باشعور ہوتے اور انہیں اپنے ملک، معاشرے اور گھر کو بچانے کا احساس ہوتا تو وہ قبائلی یلغار کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے۔ لیکن افسوس صد افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ ایک طرف مظفر آباد سے سرینگر تک اور دوسری طرف بھمبر سے جموں تک غیر ریاستی مسلح دہشت گردوں نے ہمارے وطن عزیز میں داخل ہو کر قتل عام کا بازار گرم کر دیا۔

یہ قتل عام کرنے والے اور کروانے والے کون تھے؟ نیز ان کے عزائم کیا تھے؟ یہ راز اب پوشیدہ نہیں رہا۔ زمانہ اس حقیقت کو جان چکا ہے کہ 1947ء میں ریاست جموں کشمیر پر طاقت اور جبر کے ذریعے قبضہ کرنے کا مکروہ کھیل پاکستان کے ارباب اختیار نے شروع کیا اور اُس کے ردِ عمل میں بھارت نے بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ ان شیاطین اور سامراجی قوتوں کا یہ کھیل تادم تحریر جاری ہے اور میری دھرتی ماتا کے باسیوں کی بد نصیبی یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہے کہ ہمارے یہ بدنیت اور بدکار پڑوسی اپنے جنم دن سے ہی ہمارے ساتھ کیا کرتے آئے ہیں اور کیا کرنے جا رہے ہیں۔

22 اکتوبر 1947ء کو علی الصبح پاکستان کے مسلح قبائلیوں نے جو خونی کھیل شروع کیا تھا اُسے اب پورے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہ کھیل کھیلنے والوں کے بارے اب ہمیں کوئی نہ کوئی فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا۔ ان قوتوں کا راستہ روکنا اب لازم ہو چکا ہے۔ بحیثیت قوم اگر ہم ایسا کر سکتے تو ہم زندہ سلامت رہیں گے اور ہماری ریاست اپنے تشخص اور وجود کو بچا پائے گی لیکن خاکم بدھن اگر ہم ایسا نہ کر سکتے تو کشمیری نیست و نابود ہو جائیں گے اور ریاست جموں کشمیر دنیا کے نقشے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گی۔ اب قوم یہ فیصلہ کر لے کہ اُسے اپنے اور اپنی نسلوں کے لیے کس قسم کے مستقبل کی حکمت عملی طے کرنی ہے۔

میرے لیے یہ لمحہ نہایت فخر، خوشی اور مسرت کا حامل ہے کہ میں 65 برس قبل کے ایک قیامت خیز سانحہ کی ایک چشم دید داستان ”ایک ماں کی سچی کہانی“ کشمیر کی نئی نسل کے حضور پیش کر رہا ہوں۔ اس کتاب کی مصنفہ کا تفصیلی تعارف آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ میں یہاں مختصر اُیہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب 1947ء کے فوراً بعد بھارت سے ہندی زبان میں شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا ”کشمیر پر حملہ“ بعد ازاں 1954ء اس کا انگریزی ایڈیشن

”KASHMIR 1947 A Survivors Story“

کے عنوان سے شائع ہوا۔ اسی ایڈیشن کو 2005ء میں بھی شائع کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ریاست جموں کشمیر کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور کشمیر کے علمی و ادبی ورثہ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ لہذا ضرورت اس امر کی تھی کہ نوجوانانِ قوم کو اس ورثہ سے آگاہ کیا جائے اور انہیں اُن تاریخی سچائیوں کو جاننے کا موقع فراہم کیا جائے جس سے وہ آگاہ نہیں ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے اور باشعور قارئین جو اس کتاب کا گہرائی سے مطالعہ کریں گے وہ اپنی قومی تاریخ کے بے شمار گوشوں سے کما حقہ آگاہ ہوں گے اور مستقبل کے لیے راہِ عمل متعین کرنے میں انہیں خاصی راہنمائی میسر آئے گی۔ کیونکہ ہمارے وطن پر قابض پڑوسی سامراج کے جارحانہ عزائم کم ہونے کے بجائے مسلسل بڑھتے چلے جا رہے ہیں اس لیے ہمیں آنکھی کھلی رکھنا ہوں گی اور ہوش و حواس برقرار رکھنا ہوں گے۔

کشمیر پر قبائلی حملے کے حوالے سے راقم کی تصنیف ”یادوں کے زخم“ دو سال قبل منظرِ عام پر آ گئی تھی۔ اس میں چودہ ایسے عینی شاہدین کی یادیں قلم بند کی گئی ہیں جو 1947ء کے اس خوں آشام منظر کے چشم دید گواہ تھے اور منظرِ آباد سے لے کر بارہ مولاتک جو قیامت ڈھائی گئی تھی اُس سے بخوبی آگاہ تھے۔ چونکہ کرشنا مہتا بھی اس سانحے کی ایک چشم دید گواہ تھیں لہذا اُن کی یہ کتاب اس موضوع پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کرشنا مہتا کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ہمارے نامور دانشور اور قلم کار پروفیسر ایم اے آر کے خلیق صاحب نے کیا ہے۔ میں پروفیسر موصوف کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے پیرانہ سالی میں نہایت محنت اور عرق ریزی سے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ میں پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی مرحوم کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہی راقم کو کرشنا مہتا کی اس کتاب کی فوٹو کاپی مہیا کی تھی۔

اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے میں اپنے وطن عزیز جموں کشمیر کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی توجہ اس طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو پڑھیں اور دیکھیں کہ کیسے ایک ماں نے، ایک بیوی نے، ایک بہن اور ایک بیٹی نے حیرت انگیز اور غیر معمولی کردار کا مظاہرہ کیا۔ یہ کردار حُب الوطنی، انسان دوستی، دیانت داری، سچائی، انصاف پسندی، جرأت، استقلال، بے خوف، بے باکی، فہم و فراست اور دور اندیشی جیسی گونا گوں خوبیوں کا مرقع ہے۔ ہمیں اپنی زندگیوں میں ایسے ہی اوصافِ حمیدہ پیدا کرنے ہیں۔

محمد سعید اسعد

ڈائریکٹر ادارہ نیکس میرپور: 0344-5663443

Skype Id : mohammasaeedasad E.mail: niks.mirpur@gmail.com



# کرشنا مہتا

## (مختصر سوانحی خاکہ)

تحریر: محمد سعید اسعد

کرشنا مہتا 4 جون 1913ء کو ریاست جموں کشمیر کے سرسبز و شاداب علاقہ کشتواڑ کے مہتا خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اس خاندان کے کئی افراد ریاست میں اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ مہتا بستی رام 1902ء بکری سے 1916ء بکری تک لداخ کے منتظم اعلیٰ (وزیر وزارت) رہے۔ انہوں نے لداخ میں نظم و نسق قائم کرنے اور تعمیر و ترقی کے حوالے سے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ کرشنا مہتا انہی کی اولاد سے تھیں۔

کرشنا مہتا کی تعلیم و تربیت نہایت اچھے اور آسودہ حال ماحول میں ہوئی۔ اُن کی شادی اپنے ہی خاندان کے ایک سرکاری آفیسر شری دُونی چند مہتا سے ہوئی جو ریاستی انتظامیہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ دُونی چند مہتا لمبا قد کا ٹھہر رکھتے تھے اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نہایت ہی ایماندار، دیانتدار، فرض شناس، محبت وطن، دلیر اور شریف النفس انسان تھے۔ وہ جموں، پونچھ اور سری نگر میں انتظامی عہدوں پر تعینات رہے۔ جولائی 1947ء میں انھیں بحیثیت وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) مظفر آباد میں ٹرانسفر کیا گیا۔ مظفر آباد ریاست جموں کشمیر کا ایک سرحدی قصبہ تھا جو پاکستان کے قبائلی سرحدی صوبے کے ساتھ منسلک تھا۔ اپنے خاوند کی ٹرانسفر کے ایک ماہ بعد کرشنا مہتا بھی بچوں کے ہمراہ سری نگر سے مظفر آباد آ گئیں۔ مظفر آباد کی غیر یقینی سرحدی صورت حال اور پاکستان کے قبائلی علاقے سے منسلک ہونے کے پیش نظر کرشنا مہتا اس ماحول سے مانوس نہ ہو سکیں اور ایک انجانا خوف ان کے دامن گیر رہا۔ بالآخر وہ گھڑی آن پہنچی جب 22 اکتوبر 1947ء کو علی الصبح صوبہ سرحد کی طرف سے مسلح قبائلیوں نے یلغار کرتے ہوئے مظفر آباد پر چڑھائی کر دی اور مظفر آباد میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس حملے کے دوران دُونی چند مہتا نہایت دیانت داری، وفاداری اور بے خونی کے

ساتھ حملہ آوروں کے خلاف ریاستی دفاع کا مقدس فریضہ سرانجام دیتے ہوئے حملہ آوروں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ کرشنا مہتا گولیوں کی بوچھاڑ میں اپنے ایک چڑاسی کی مدد سے بچوں کو لے کر گھر سے نکل گئی اور مختلف گھروں اور دیہاتوں میں روپوش رہی اور نہایت کٹھن حالات سے دوچار رہی۔ بازیاب ہونے پر اسے بچوں سمیت حکومتی نگرانی میں رکھا گیا۔ قبائلی سرداروں اور حکومت آزاد کشمیر کے اعلیٰ حکام نے ہر ممکن کوشش کی کہ کرشنا مہتا اپنے خاوند کی جدائی اور غیر مسلموں کے قتل عام کا غم بھول کر ایبٹ آباد یا مظفر آباد میں مستحضر رہائش اختیار کر لے۔ لیکن اس کی غیرت، محبت، خودداری اور فہم و بصیرت نے ایسی تمام پیشکشیں ٹھکراتے ہوئے بالآخر قیدیوں کے تبادلے میں ہندوستان چلے جانے کو ترجیح دی۔ چنانچہ کرشنا مہتا، اس کے بچوں اور دیگر قیدیوں کو براستہ ایبٹ آباد، راولپنڈی لایا گیا۔ کچھ روز تک پونچھ ہاؤس میں رکھا گیا۔ پھر پاکستانی حکام نے انہیں جیل بھیج دیا۔ چند روز تک جیل میں رکھنے کے بعد میرپور بھیج دیا گیا جہاں دتیاں گاؤں میں خواجہ عبدالعزیز نے اپنے گھر میں غیر مسلم خواتین اور بچوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ کرشنا مہتا نے اپنی داستانِ غم رقم کرتے ہوئے خواجہ عبدالعزیز کے حسن سلوک اور حسن اخلاق کی بے حد تعریف کی ہے۔ دتیاں کمپ سے ان پناہ گزینوں کو براستہ لاہور امرتسر بھیج دیا گئے۔

امرتسر پہنچ کر کرشنا مہتا اپنے بچوں کے ہمراہ بی بی سنت کور کے قائم کردہ پناہ گزین کمپ میں قیام پذیر ہوئیں۔ امرتسر میں کچھ روز ٹھہرنے کے بعد وہ کرک شرا کمپ میں منتقل ہو گئیں۔ بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو جب اس پناہ گزین کمپ کے دورے پر آئے تو کرشنا مہتا نے ان سے ملاقات کی اور انہیں اپنی پیتا سائی۔ نہرو اس خاتون کی ہمت اور استقلال بھری کہانی سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اُسے اپنی منہ بولی بہن بنا کر اپنے ہمراہ دہلی لے گئے۔ کرشنا اور اُس کے بچے پنڈت نہرو کے گھر ایک فیملی ممبر کی حیثیت سے ایک ماہ تک قیام پذیر رہے۔

مئی 1948ء میں جب پنڈت نہرو نے کشمیر کا دورہ کیا تو وہ کرشنا مہتا کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ وہاں پنڈت نہرو کی تجویز پر کرشنا مہتا کو ”گاندھی سیوا سادان“ کے نام سے ایک ادارہ قائم کر کے دیا گیا جس کا کام خواتین کو گھریلو دستکاریاں سکھانا تھا۔ اس ادارے نے رفتہ رفتہ بہت ترقی کی اور اس کی بیسیوں شاخیں کشمیر کے مختلف علاقوں میں قائم کی گئیں۔ جہاں سے ہزاروں خواتین نے ہنرمندی کی تربیت حاصل کی۔ سادان کی زیر نگرانی بچوں اور مریمضوں کے لیے بھی ادارے قائم کیے گئے۔

کرشنا مہتا کو بھارتی لوک سبھا کا کرمبر نامزد کیا گیا۔ وہ پہلی کشمیری خاتون تھیں جو بھارتی پارلیمنٹ



کی رکن بنیں۔ انہوں نے ایک ہندو سادھو ”گن بابا“ سے روحانی فیض بھی حاصل کیا۔ اور دس برس تک دادا جی آشرم میں قیام پذیر رہیں اور تعلیم و تربیت سے وابستہ رہیں۔

کرشنا مہتا نے کشمیر اور بھارت میں سماجی سطح پر ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کو اپنے آبائی علاقے کشتواڑ کا دورہ کروایا اور مقامی آبادی کے لیے مراعات حاصل کیں۔

کرشنا مہتا 20 اکتوبر 1993ء میں اسی برس کی عمر میں انتقال کر گئیں اور اُن کی وصیت کے مطابق اُن کی ارتھی کی خاک کو دریائے چندرا بھاگا (چناب) میں بہایا گیا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے  
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(اقبالؒ)



## تقریظ

یہ کتاب ”ایک ماں کی سچی کہانی“ کرشنا مہتا کی آپ بیتی ہے۔ جس کی اہمیت میں کوئی شک نہیں، اس لیے کہ اس نے برصغیر کی تقسیم کے نتیجہ میں جموں کشمیر کی سازش کو طشت از بام کر کے رکھ دیا ہے۔ اور اب دونوں ”دوقومی نظریے“ اور ”جموں کشمیر کی تقسیم کے حامی“ بغلیں بجاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں کہ اقوام مذہب کی بنیاد پر بنتی ہیں تو دنیا کے ہر ملک میں مختلف مذاہب کے لوگ کیسے رہ رہے ہیں۔ یہ دوسرے ممالک تقسیم کیوں نہیں ہوتے۔ امریکہ، برطانیہ، روس، چین، غرضیکہ دنیا کے ہر ملک میں دیگر تمام مذاہب کے علاوہ مسلمان بھی موجود ہیں تو وہاں تقسیم کا مسئلہ کیوں پیدا نہیں ہوتا اور پاکستان وہاں کے مسلمانوں کے لیے الگ ملک کا مطالبہ کیوں نہیں کرتا؟

حقیقت یہ ہے کہ عقیدے کی بنیاد پر قومیں بننے یا بنانے کا کبھی بھی کوئی جواز نہیں ہوتا اور نہ کبھی ایسا ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء اور رسول عربی ﷺ سب نے اپنے ہم وطنوں ہی کو اپنی قوم کے طور پر خطاب کیا ہے خواہ وہ انہیں مانتے تھے یا نہیں۔ دنیا میں کہیں بھی آپ کو ایسی مثالیں نہیں ملیں گی جہاں عقیدے اور مذہب کی بنیاد پر قومیں بنی ہوں یا بنائی گئی ہوں۔ پاکستان کے علاوہ ایک اور مثال اسرائیل کی دی جاتی ہے لیکن یہ ریاست تو محض نسل کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس نسل کا مذہب بھی ایک ہے۔ لیکن اس لحاظ سے اُسے نظریاتی ریاست نہیں کہا جاسکتا۔ وہ نسل کو قومیت یا قوم کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں مذہب کو نہیں۔ اس لحاظ سے پاکستان واحد ریاست ہے جو نظریے کی بنیاد پر قائم ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہے۔ میرا خیال ہے نہیں۔ کیونکہ پاکستان میں بیک وقت کئی نظریات متوازی چل رہے ہیں اور ابھی تک کسی ایک کو بھی حتمی (Final) فتح نہیں ہوئی۔ بہر حال یہ معاملہ ایک طویل بحث کا متقاضی ہے اس لیے اختصار کا تقاضا کرتی ہوئی اس تحریر میں اس موضوع پر مفصل گفتگو نہیں ہو سکتی۔

برصغیر تقسیم ہوا تو دیگر خود مختار اور نیم خود مختار ریاستوں کی طرح ریاست جموں کشمیر کے مستقبل کا سوال بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ سوال دراصل فرقہ پرست قوتوں نے پیدا کیا، ورنہ اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ

ریاست میں حق حکمرانی اور جمہوریت کے لیے پہلے سے جدوجہد موجود تھی۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ اسے ہندوستان یا پاکستان میں سے کس کے ساتھ جانا ہے یا پہلے ہی کی طرح خود مختار رہنا ہے۔ کیونکہ 3 جون 1947ء کے اعلان آزادی ہند (برصغیر کی تقسیم کا قانون) کے مطابق ریاست کے لیے تینوں راستے کھلے تھے اور حکمران کو اختیار تھا کہ وہ ان میں سے کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ریاستوں کے حکمرانوں کو فیصلہ کرنے کا یہ حق بھی مسلم لیگ کے صدر اور پاکستان کے بانی جناح صاحب کی تجویز پر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ریاست کے حکمران نے اپنی ریاست کو خود مختار رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ مختلف مذاہب کی حامل ریاست کا الحاق نہ تو ہندوستان کے ساتھ مناسب رہے گا اور نہ پاکستان کے ساتھ۔ مسلمان ہندوستان کے ساتھ الحاق کو قبول نہیں کریں گے اور غیر مسلم پاکستان کے ساتھ۔ پھر انتقال آبادی کا مسئلہ پیدا ہوگا جس میں قتل و غارت کے امکانات کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ بعد میں ہوا بھی، بلکہ ابھی تک جاری ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ریاست کو اندرونی طور پر پہلے ہی کی طرح خود مختار رہنے دیا جائے۔ پاکستان نے اس تجویز کو تسلیم کر کے حکمران کے ساتھ معاہدہ بھی کر لیا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ لیکن چونکہ نہ تو تجویز کو کھلے دل سے تسلیم کیا گیا تھا اور نہ ہی معاہدہ کرنے میں نیک نیتی اور خلوص شامل تھا۔ پاکستان کی شدید خواہش تھی کہ مہاراجہ ہری سنگھ پاکستان کے ساتھ غیر مشروط الحاق کر کے ریاست سے چلا جائے لیکن مہاراجہ ہری سنگھ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ اُس کی تجویز جموں کشمیر کے عوام کے لیے زیادہ بہتر تھی۔ چنانچہ پاکستان نے اُسے غیر مشروط الحاق پر مجبور کرنے کے لیے مختلف حربے آزمانا شروع کیے۔ ضروری اشیاء کی سپلائی بند کی۔ ریاست کے مسلم اکثریتی علاقوں میں، جہاں مسلم کانفرنس زیادہ مؤثر تھی، میں فرقہ واریت کی آگ بھڑکانے کے لیے ہر قسم کا ایندھن فراہم کیا اور جب کوئی حربہ کارگر نہ ہوا تو 22 اکتوبر 1947ء کو اپنی فوج کی نگرانی میں قبائلیوں کا ایک بڑا لشکر مظفر آباد میں داخل کر دیا جنہوں نے ظلم و بربریت کی نئی تاریخ رقم کی جس کی وجہ سے ریاست جموں کشمیر کا حکمران ہندوستان کے ساتھ الحاق پر مجبور ہوا اور ہندوستان نے 27 اکتوبر کو اپنی فوج کشمیر میں داخل کر دی۔ پاکستان نے صرف یہ نہیں کیا بلکہ اس سے تین روز قبل 24 اکتوبر 1947ء کو جموں کشمیر کے مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل باغی حکومت ("آزاد کشمیر") بھی کھڑی کر دی جسے اشتعال انگیزی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ ایسے میں ریاست کے حکمران کے پاس اور کونسا راستہ رہ جاتا تھا؟ اور یہ سب اس لیے ہوا کہ پاکستان نے مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے برترین عہد شکنی کا ارتکاب کیا۔ ساٹھ سال سے ہندوستان پاکستان اور جموں کشمیر کے عوام پاکستان کی بوئی ہوئی وہی فصل کاٹ رہے ہیں۔ جانے سلسلہ

کب تک جاری رہے گا۔ کبھی ختم ہوگا بھی یا نہیں۔

اس پس منظر میں 22 اکتوبر 1947ء کو علی الصبح قبائلی لشکر مظفر آباد میں داخل ہوا اور اُسکے بعد جو کچھ ہوا وہ سب آپ ”کرشنا مہتا“ کی کتاب ”ایک ماں کی سچی کہانی“۔ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، پڑھیں گے۔ مجھے خدشہ ہے کہ پڑھتے وقت کئی بار آپ اپنے جذبات کو قابو سے باہر ہوتے ہوئے محسوس کریں گے۔ کیونکہ ترجمہ کے دوران کئی بار میری اپنی پلکیں بھینکتی رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی معاملات میں مجرم نہ ہونے کے باوجود میں اپنے آپ کو احساسِ جرم کی حرارت سے محفوظ نہیں رکھ سکا۔ اس کے باوجود کہ کرشنا مہتا نے اس اندوہناک تاریخی حادثے کے سیاسی پہلو پر کوئی بات نہیں کی۔ اشارۃً بھی نہیں۔ نہ اُس نے پس منظر بتایا اور نہ ہی ملک کے حال اور مستقبل کے بارے کوئی تبصرہ کیا۔ یوں لگتا ہے کہ مصنفہ ایک تعلیم یافتہ اور گھریلو خاتون ہے جو آخر وقت تک اسی حیثیت سے بولتی رہی۔ اور یہی بات اس تاثر کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ کرشنا مہتا نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔ اس لیے کہ اُس نے بہت سے مسلمان کرداروں کی جنہوں نے کسی بھی طرح اُس کی ہمت افزائی کی، اُس سے ہمدردی کا اظہار کیا یا اُس کی مدد کی دل کھول کر تعریف کی ہے حتیٰ کہ اُس نے قبائلی حملہ آوروں میں سے چند افراد کی تعریف کرنے میں کسی نخل سے کام نہیں لیا اور یہ بہت مشکل کام تھا کیونکہ بربریت کی تاریخ بھی اُنہی کے ہاتھ سے رقم ہوئی۔ اگر ہم غور کریں تو ہم مصنفہ کی وسعتِ نظر اور ہمت و جرأت پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُس نے بدترین حالات کا سامنا کرنے کے باوجود اپنے جیلروں (Captors) جن کے ہاتھوں وہ ناقابلِ برداشت مصائب و آلام کا شکار ہوئی کی بھی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ البتہ اس کے لیے اُس نے زیادہ مسرفانہ اور خوشامدانہ زبان استعمال نہیں کی اور اپنے قلم کو سنجیدگی کی راہ سے بھٹکنے نہیں دیا۔ یہ ہمارے لیے سبق آموز بھی ہے اور چشم کشا بھی کہ ہم نے انسانوں اور اکثر بے گناہ انسانوں کو آگ اور خون کے کیسے کیسے بے رحم دریاؤں میں غرق کیا۔

اس کتاب میں مصنفہ نے اپنی زندگی کے اُن مصائب و آلام کے باوجود جو اکتوبر 1947ء میں اُسے درپیش تھے، کے ضمن میں کسی فوری اور جذباتی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا جسے تعصب، تنگ نظری اور جذباتیت پر محمول کیا جاسکے بلکہ جن احساسات، جذبات، تاثرات اور خیالات کا اظہار کیا اُن کا تعلق انسان کی انفرادی اور سماج کی اجتماعی فطرت سے ہے۔ جس کے مختلف پہلوؤں کو اُس نے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور ان حالات و واقعات کی ذمہ داری کا تعین کرتے وقت کسی ایک فرد گروہ جماعت یا مذہب کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا۔ حالانکہ ان حالات کے پس منظر اور پیش منظر دونوں پر مذہب اور سیاست کی گہری چھاپ موجود ہے۔ بلکہ یہ

سارے حالات، واقعات اور حادثات مذہب اور سیاست ہی کی پیداوار تھے لیکن کرشنا نے نہ تو کسی مذہب اور نہ ہی کسی ایک سیاسی پارٹی کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اُس نے مسلمانوں کے ہاتھوں تعصب، تسلط، تشدد اور ظلم و بربریت کا شکار ہوتے وقت بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور مذہب اسلام پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں کی بلکہ انسان کے اندر مستقل طور پر موجود منفی قوت اور وحشی جبلت اور ساتھ ہی اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کرنے اور استعمال کرنے والوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔ میرے نزدیک مصنفہ اس لحاظ سے بھی صبر و ضبط، حوصلے، سنجیدگی اور بردباری کی اعلیٰ منزل پر فائز ہونے کا حق رکھتی ہے کہ اُس نے اپنی اس نادر و نایاب تصنیف جو برصغیر بالخصوص جموں کشمیر کی نئی نسلوں کے لیے بے حد اہم تاریخی معلومات کی حیثیت رکھتی ہے، کے ذریعے کسی قسم کی سیاست نہیں کی اور محض اندوہناک اور دل فگار واقعات اور حادثات کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ جو بہت بڑی اور غیر معمولی بات ہے جس کی توقع ایک عام انسان سے نہیں کی جاسکتی۔

یہ کتاب ایک اور حوالے سے بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں پہلی بار اُن واقعات اور حوادث کا علم ہوا جنہیں اُس پار کے سیاستدانوں، دانشوروں اور مورخین نے اپنی کذب و افتری کی حاشیہ بردار محدود صلاحیتوں کے ذریعے تقریباً غائب ہی کر دیا تھا اور اگر کچھ تھا بھی تو وہ شک و شبہ کی دھند اور ”جہاد“ کی مقدس اصطلاح میں لپٹا ہوا تھا۔ لیکن اب اس کتاب کے انکشافات کسی جفاکاری اور سامری کو اس شیطانی کھیل کے مقاصد اور نتائج کو مقدس اصطلاحوں میں لپیٹ کر اپنے جرائم اور گناہوں سے بری الذمہ ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اور اگر جموں کشمیر کی نئی نسل نے سنجیدگی کی راہ اختیار کی تو انہیں نام نہاد ہیرو (Heroes) کے مقام اور منصب کا از سر نو تحقیق کرنے کا فریضہ سرانجام دینا ہوگا جنہوں نے ایک تاریخی فراڈ کے ذریعے انہیں دُنیا بھر کے سامنے شرمسار کیا ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ کرتے میری پوری کوشش رہی ہے کہ میں مصنفہ کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اُس کے خیالات کو من و عن اردو میں منتقل کر سکوں یا کم از کم اُسکے اس قدر قریب اور آس پاس رہوں کہ اُسکے خیالات کی روح مجروح نہ ہو۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ کسی بھی ترجمہ میں مصنف کے احساسات، جذبات، تاثرات اور خیالات سب کچھ منتقل ہو لیکن ترجمہ کے اس کاروبار میں مصنف کے ساتھ پورا انصاف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خیالات کو جب ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے تو کہیں نہ کہیں تو یہ سب احساسات، جذبات، تاثرات، خیالات اور معنی و مفہوم اغماض اور انحراف کی زد میں آ ہی جاتے ہیں اور میں تو خیر کوئی سکے بند مترجم بھی نہیں۔ تاہم مترجم کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس ضرور ہونا چاہیے کہ وہ کم از کم مصنف کے خیالات کی روح کو



مخروج نہ ہونے دے۔ میں نے ترجمہ کرتے وقت یہی کوشش کی ہے۔ کتنا کامیاب رہا ہوں، یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

اب جبکہ کافی کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے، تو مجھے ایک اور فریضہ بھی سرانجام دینا ہے اور وہ یہ کہ مجھے اور قارئین کو جموں کشمیر بالخصوص ”کشمیریت“ کے حوالے سے دانشور، ریسرچ سکالر، مصنف اور مولف جناب محمد سعید اسعد کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے اس کتاب کو دریافت کیا، حاصل کیا اور اُس کے اردو ترجمے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے میری توجہ اس جانب مبذول کروائی اور مجھے تحریک کی کہ میں اس فرض کو سرانجام دوں چنانچہ میں نے یہ حقیر سی کوشش کی۔

پروفیسر ایم اے آر کے خلیق

051-5820162

راولپنڈی

10 اکتوبر 2012ء



## طوفان کے آثار

مظفر آباد کشمیر کے شمال مغرب میں سرحد کے قریب واقع ہے۔ قبائلی حملے سے پہلے یہ ریاست کشمیر ہی کا حصہ تھا۔ پہاڑوں میں محصور یہ ضلع دریائے کشن گنگا (دریائے نیلم) کے آر پار پھیلا ہوا اور سبزے سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہاں سے ایک سڑک راولپنڈی جاتی ہے اور دوسری ضلع ہزارہ میں واقع ایبٹ آباد جو اب پاکستان کا حصہ ہیں۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر پنجاب کے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ امیر ہوں یا غریب، وہ محنتی اور سادہ ہیں۔ اکثر خوش شکل اور عام طور پر تنومند ہیں۔ یہ ضلع ریاست کشمیر کی طرف سے ایک وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) کے ماتحت ہوتا تھا اور اُسکے ساتھ کئی اور آفیسر مثلاً سب جج، اسٹنٹ انسپکٹر آف پولیس، انجینئر، اسٹنٹ سرجن اور ڈسٹرکٹ فارسٹ آفیسر (ڈی۔ ایف۔ او) بھی ہوتے تھے۔ اسکے علاوہ اُسکی مدد کیلئے کرنل کی کمانڈ میں فوج کی ایک کمپنی بھی ہوا کرتی تھی۔

کشمیر کی حکومت نے میرے شوہر شری دُونی چند مہتا کو جولائی 1947ء میں وزیر وزارت کی حیثیت سے مظفر آباد میں تعینات کیا۔ اُس سے قبل وہ سری نگر میں اسٹنٹ گورنر کے عہدہ پر تعینات تھے۔ میں اُن کے ساتھ مظفر آباد نہ جاسکی کیونکہ مجھے کچھ مہمانوں کی جو ہمارے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے، دیکھ بھال کرنی تھی۔ تقریباً ایک ماہ بعد وہ سرکاری دورہ پر سری نگر آئے اور واپسی پر بچوں کو بھی ساتھ لے گئے اور مجھے کہا کہ مہمانوں کے چلے جانے کے بعد میں بھی وہاں پہنچ جاؤں۔

ایک ہفتہ کے بعد میں بھی مظفر آباد پہنچ گئی۔ یہ جگہ میرے لئے اجنبی نہیں تھی لیکن اس موقع پر جانے کیوں میں اس سے محفوظ نہیں ہو سکی۔ مجھے اپنے ماحول سے ایک مبہم سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایسا کیوں ہے لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھاگ کر کہیں اور چلی جاؤں۔ میں اس قدر مایوس تھی کہ میں نے ابھی سامان تک نہیں کھولا تھا۔ میں اکثر اپنے شوہر سے کہتی تھی کہ ہمیں یہاں سے نکل کر کہیں اور چلے

جانا چاہیے۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے اور میں سامان نہیں کھولوں گی۔ میرا شوہر اُن دنوں اپنے کام میں اس قدر مصروف تھا کہ اُسکے پاس میرے ساتھ بات چیت کرنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ وہ اکثر کزنل کو ساتھ لے کر سرحد کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گاؤں گاؤں دوڑتے پھرتے تھے اور کبھی اشارۂ بھی مجھے نہیں بتایا کہ کوئی ناخوشگوار بات بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ وقت کے بعد انہوں نے ہمارے بنگلے کے سامنے والی چھوٹی پہاڑی پر جنگلہ نصب کرنا شروع کیا۔ ہمارا بنگلہ ایک چھوٹے سے ٹیلے کے کنارے پر واقع تھا جس کے ارد گرد کھلا میدان تھا اور سامنے ایک باغ تھا۔ باغ اور بنگلہ لکڑی کے بنے ہوئے تختوں کے جنگلے سے محصور تھے۔ پولیس کا اسٹنٹ انسپکٹر ہمارے قریب ہی ایک بنگلہ میں رہتا تھا جبکہ ہسپتال اور ڈاکٹر کا بنگلہ کوئی دو فرلانگ دور مسجد کے قریب واقع تھے۔ ہمارے بنگلہ کی دوسری طرف گھنے جنگل کے کنارے پر مسلمانوں کی ایک زیارت تھی۔ ہمارے بنگلے سے ایک تنگ راستہ (جانوروں کا راستہ) پہاڑی سے گزر کر زیارت کی طرف جاتا تھا۔ لیکن لوگ بمشکل ہی اسے استعمال کرتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی تنہا کتا شکار کی تلاش میں اس راہ پر چلتا ہوا نظر آ جاتا تھا اور ساتھ ہی گدھوں اور لالوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔

میرے مظفر آباد آنے کے تیسرے دن ”جنم اِشتامی“ کا تہوار تھا۔ ہمارے گھر میں سب لوگ روزہ سے تھے اور شام کو میں اپنے ملازم کو لے کر مندر میں حاضری دینے کیلئے گئی تاکہ کچھ نذرانہ اور پھول دیوی (Deity) کی بھینٹ چڑھا سکوں۔ لیکن وہ حیرت انگیز طور پر مندر کے پھاٹک پر لڑکھڑا کر گرا اور نذرانے سے بھری ہوئی پلیٹ بھی گر پڑی اور کھڑکھڑاہٹ کی زوردار آواز آئی۔ میرے ذہن میں فوری طور پر یہ خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ آنے والے تاریک دنوں کیلئے تنبیہ ہے۔ اسکے بعد پورے دو دن تک یہی حادثہ میرے ذہن پر سوار رہا اور میں کسی اور بات کے بارے میں سوچ سکی۔ بہر حال چند دنوں کے اندر اندر بتدریج میں یہ سب کچھ بھول گئی۔

لیکن اس کے بعد بھی اس ماہ کے دوران عجیب و غریب واقعات رونما ہوتے رہے۔ ایک تو یہ کہ گھر کے مختلف حصوں میں کئی قسم کے سانپ دکھائی دیتے رہے اور ہم سب اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کرنے لگے اور گھبرائے ہوئے سے رہنے لگے۔ کبھی تو یہ سانپ بچوں کے پنگھوڑوں سے نکل پڑتے تھے، کبھی بیڈ منٹن کورٹ میں۔ ایک دن تو یہ سانپ ہمارے دو ملازموں کے منہ پر اُس وقت آن گرا جب وہ سوئے ہوئے تھے۔ خوش قسمتی سے اُس نے انہیں ڈسا نہیں۔ یوں لگتا تھا کہ موت ہر طرف سے ہم پر حملہ آور ہونے والی ہے۔ میں ہر شام کو بچوں سمیت دُعا کرتی تھی اور دُعا کرتے ہوئے اس قدر خوش رہتی تھی اور چاہتی تھی کہ میں ہر وقت دُعا ہی کرتی

رہوں۔ میں اپنے گھر کو ایک آئیڈیل گھر سمجھتی تھی، اور اس کی دیکھ بھال کرتے ہوئے مجھے کبھی بوریت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بہر حال، تمام دیگر لوگوں کی طرح ہمیں بھی مشکلات درپیش ہوتی تھیں۔ جن میں مالی اور دیگر ہر طرح کی مشکلات تھیں، لیکن ان کی وجہ سے کبھی پریشان نہیں ہوئی کیونکہ میں محسوس کرتی تھی کہ میرے شوہر ان سب کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے گھر میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس کی وجہ سے ہمیں شرمندہ ہونا پڑے۔ اگرچہ میرے شوہر ایک اہم عہدہ پر فائز تھے، پھر بھی ہم بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں نہ تو کبھی رشوت کا روپیہ پیسہ آیا اور نہ ہی رشوت کے باعث کبھی تحفے تحائف آئے۔ وہ اکثر مجھے بتایا کرتے تھے۔ ”میں امیر آدمی نہیں ہوں۔ میرے بچوں کی پرورش اُسی تنخواہ پر ہو رہی ہے جو میں اپنے خون پسینے سے کما رہا ہوں۔ کیا تم نہیں سمجھتی کہ ہمیں اپنے بچوں کو سادہ زندگی گزارنے کی تربیت دینی چاہیے؟ یہ دراصل اُن کے لئے بھی بہتر ہی ہوگا۔ عیش و عشرت کی زندگی بالآخر انسان کے لئے بوجھ بن کر رہتی ہے۔“

اُن کی نگرانی میں بچوں کی پرورش اُسی طرح ہو رہی تھی جس طرح وہ چاہتے تھے لیکن جب تک وہ ہمارے ساتھ رہے میں خود اپنے آپ کو سادگی اور نظم و ضبط میں نہیں رکھ سکی۔ خوش حال والدین کی پہلی اولاد ہونے کی حیثیت سے میں آرام و آسائش اور کثرت و فراوانی کے ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ میرے ارد گرد خادموں اور خادماؤں کا ایک ہجوم ہوتا تھا جس کی وجہ سے میں فطری طور پر اُمراء و رؤسا کے طرز زندگی کی عادی ہو گئی تھی۔ اپنے سر کے گھر آنے کے بعد میں نے کئی بار کوشش کی کہ میں اپنے شوہر کے نظریہ کے مطابق صبر و برداشت اور راضی بہ رضارہنے کی عادت ڈالوں لیکن اپنے آپ کو اس قسم کے نظم و ضبط کے تابع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ سخت کوشش زندگی گزارنے کی خواہش تو موجود تھی لیکن میں اس کا کامیاب تجربہ نہیں کر سکی اور اس سلسلہ میں میری بے بسی نے کئی بار مجھے آنسو بہانے پر بھی مجبور کیا۔

میں مظفر آباد میں رہنے کے بارے اب بھی بے آرامی اور پریشانی کا شکار تھی۔ میں نے اپنے شوہر کو بتایا ”میں کچھ دنوں کے لئے سرینگر جانا چاہتی ہوں۔ بچے بے شک ادھر ہی رہیں، میں جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔“ پہلے تو انہوں نے اتفاق کر لیا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ ”فی الحال مت جاؤ۔ میں کچھ فوجی آفسروں کو کھانے پر بلانا چاہتا ہوں کیا تم اس کے بعد نہیں جاسکتی؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

چند دن اور گزر گئے اور پھر ایک دن گھر آنے کے فوراً بعد انہوں نے کہا ”تم جانتی ہو؟ کرنل کہتا ہے کہ ہم بچوں کو سرینگر بھیج دیں اور خود اُس کی جگہ شفٹ ہو جائیں۔ وہ دو میل میں رہتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں ہم کسی بھی قسم کی ایمر جنسی میں کئی جیپس (Jeeps) اور ٹیلی فون وغیرہ آسانی سے استعمال کر سکیں گے۔“

”کیا آپ نے اُس سے اتفاق کر لیا؟“

”ارے نہیں! میں نے کرنل کو بتا دیا ہے کہ مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں کو مظفر آباد چھوڑنے سے روکوں، اس لئے میں اپنی فیملی کو بھی یہاں سے دور نہیں بھیج سکتا۔ اگر کوئی مصیبت آئی تو میری فیملی کو بھی دوسروں کے ساتھ برداشت کرنی ہوگی۔ میں اپنے فرض سے آگاہ ہوں اور اُس کے خلاف کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہتا۔“

یہ سن کر میں بہت خوش ہوئی اور میں نے اپنے شوہر کے لئے ایک انجانی سی گہری اور خفستہ عزت محسوس کی۔ میں نے اُن سے کہا کہ ”میرا خیال ہے آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کو مضبوطی سے اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ خدا جو منصفوں اور عادلوں کو برکت دیتا ہے ہمیں بھی برکت سے نوازے۔“

اگرچہ مظفر آباد بالکل سرحد پر تھا لیکن اس کے باوجود ریاست کے حکمرانوں کی لا پرواہی کی وجہ سے اُس کی حفاظت کا کوئی مناسب انتظام نہیں کیا گیا تھا اور یہ بالکل غیر محفوظ تھا۔ دوسری چیزوں کا تو ذکر ہی کیا یہاں تو ٹیلی فون تک کا انتظام نہیں کیا گیا تھا کہ ایمر جنسی کے حالات میں پیغام رسانی کا مسئلہ ہی حل ہو سکے۔ لیکن حکم یہ تھا کہ کسی کو بھی خوف کے مارے یہاں سے بھاگنا نہیں چاہیے۔

وہ سب کچھ جو میری شنید میں آیا اُس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ لوگ کسی نہ کسی چیز کے واقع ہونے کی توقع کیے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میرے شوہر بھی یہ سب جانتے تھے۔ عام طور پر وہ کوئی بات بھی مجھ سے خفیہ نہیں رکھتے تھے اور میں ہمیشہ فیصلہ کرنے سے قبل ہی اُن کے خیالات میں حصہ (Share) لیتی تھی۔ ہمارے درمیان کبھی لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ میں کبھی اُن کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ نہ ہی وہ ہر موقع پر مجھے یہ بتانا ضروری سمجھتے تھے کہ میں یہ کروں اور یہ نہ کروں۔ ہماری باہمی افہام و تفہیم مکمل اور فوری قسم کی تھی۔ وہ ہمیشہ خاموش اور متوازن نظر آتے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ کسی حد تک تیوری چڑھائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ تاہم انہوں نے اس بارے مجھے کچھ بھی نہ بتایا کہ کیا ہونے والا ہے۔ جس کی وجہ سے میں قدرے بے آرامی اور پریشانی کا شکار رہنے لگی۔ شاید یہ اس لئے تھا کہ انہیں زیادہ کام کرنا پڑتا تھا اور وہ تھکاوٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا۔ لیکن وہ باغبانی میں پہلے ہی کی طرح گہری دلچسپی لیتے تھے اور اپنے آپ کو سبزیاں اُگانے اور مختلف پھولوں کے بیج بونے میں مصروف رکھتے تھے۔ وہ کھانا پکانے کے سلسلہ میں بھی کافی محنت کرتے تھے اور باورچی خانے میں میرے لئے کافی مددگار ثابت ہو رہے تھے۔

21- اکتوبر 1947ء کو ایک کرنل، ایک کیپٹن اور چند دیگر فوجی آفیسروں کو کھانے پر بلایا گیا۔ اُس

شام بوند باندی ہو رہی تھی اور شام کافی سرد بھی تھی۔ رات کے دس بج گئے لیکن ابھی تک کوئی مہمان نہ پہنچ سکا۔



اگرچہ وہ تمام لوگ قریب ہی پولیس سپرینٹنڈنٹ کے بنگلہ میں رہتے تھے۔ میں نے چونکہ کھانا خود پکایا تھا اس لئے میں اُن کے نہ آنے سے کچھ زیادہ ہی مایوس تھی۔ جب میں نے انہیں پیغام بھیجا تو معلوم ہوا کہ کیپٹن جیپ لے کر کہیں گیا ہوا ہے اور جوں ہی وہ واپس آتا ہے ہم پہنچ جائیں گے۔ دراصل کیپٹن کہیں سرحد کا جائزہ (Reconnaissance) لینے کے لئے گیا ہوا تھا اور جب وہ واپس آیا تو اُس نے ”سب اچھا“ کی رپورٹ پیش کی۔

کھانے کے بعد جب تمام مہمان رخصت ہو گئے تو میرے شوہر بھی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ رات پہلے ہی آدھی گزر چکی تھی اس کے باوجود انہوں نے تمام بچوں کو اپنے پاس بلا لیا اور اُن کے ساتھ رنی کھیلنے لگے۔ میں بھی اپنے آپ کو اُن سے الگ نہ رکھ سکی، لہذا اُن کے ساتھ کھیل میں شامل ہو گئی۔ اسی اثنا میں انہوں نے چائے پینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں حیران تھی کہ آج اُن کا ارادہ کیا ہے اور وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ میں خود تو چائے نہیں پینا چاہتی تھی لیکن انہوں نے اصرار کیا اور کہا۔ ”پیاری! مہربانی کر کے آج کی رات کچھ تو بیو، کل تمہیں یہ کہنے والا کوئی نہیں ہوگا اور پھر شاید تمہیں افسوس ہو کہ آج کی رات تم نے انکار کیا تھا۔“ میں اُن کی اس بات سے بہت ہی پریشان اور سراسیمہ ہو گئی اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے چائے دُور پھینک دی کیونکہ کوئی چیز اس میں گر گئی تھی۔ میں کسی خطی کی طرح بار بار اُن سے پوچھ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے۔ اس سب کی حقیقت کیا ہے؟

”ارے! کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے یہ معنی و مفہوم سے خالی ہے اور اس کا کوئی اور مطلب نہیں ہے۔“

اُن کے لہجے میں بظاہر غفلت اور لاپرواہی تھی۔ لیکن میں فکر مند اور پریشان تھی۔ میں اُس سے زیادہ ”رمی“ نہیں کھیل سکتی تھی۔ لہذا ہم نے کھیل ختم کر دیا۔ رات کافی بیت چکی تھی اور بچے سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ میرے شوہر نے سب سے چھوٹے بچے کو لانے کے لئے کہا جو ہمارے سات بچوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ وہ اس چھوٹے بچے سے بہت پیار کرتے تھے اور انہوں نے کہا:

”آہا! پیاری۔ اس کو دیکھو کتنی گہری نیند سو رہا ہے۔“

اُن کے اس عجیب روئے کو دیکھ کر میں پریشان تو تھی ہی لیکن خاموش رہی۔



## طوفان آگیا

میں صبح سویرے تقریباً پانچ بجے ایک جھٹکے کے ساتھ بیدار ہو گئی اور پہاڑیوں کی مخالف سمت سے آنے والی فائرنگ کی بلند آوازوں کی بازگشت سننے لگی۔ میں دوڑ کر اپنے شوہر کے بستر کے پاس گئی تاکہ انہیں جگاؤں لیکن وہ اتنی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ انہیں جگانے میں مجھے کچھ وقت لگ گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ حملہ شروع ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت مجھے حملہ کے بارے کچھ خبر نہیں تھی لیکن اب تک کے کسی انجانے خوف نے یہ بات میرے منہ میں ڈال دی۔

انہوں نے بستر پر پہلو بدلا اور کہا کہ ”یہ حملہ نہیں ہوگا بلکہ شاید ہماری اپنی فوج نشانہ بازی کی مشق کر رہی ہوگی۔“

”لیکن آپ کیسے جانتے ہیں۔ کیا کرنل نے گزشتہ شب آپ کو بتایا تھا؟“

”نہیں تو۔“ انہوں نے کہا۔

”اوہ! پھر یقین کیجئے کہ یہ حملہ ہی ہے۔ مہربانی کر کے اٹھ جائیں۔ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ وہ لوگ آپ کے ہیں؟“ اس کے باوجود وہ یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ یہ حملہ ہی ہو سکتا ہے۔ بالآخر جب انہوں نے دیکھا کہ ہمارے بنگلے پر فائرنگ ہو رہی ہے اور لکڑی کا جنگلہ گولیوں کا نشانہ بنا ہوا ہے تو وہ بستر سے اُچھل پڑے۔ جلدی سے کپڑے پہنے اور باہر نکلنے کی تیاری کرنے لگے۔ میں نے انہیں محتاط رہنے کے لئے کہا۔ اُن کا جواب مختصر تھا۔ ”ابھی تک میرے لئے کوئی گولی بنی ہی نہیں۔“

میں اپنے بچوں کو لے کر برآمدہ میں نکل گئی اور اُس سمت دیکھنے لگی جدھر سے گولیاں آرہی تھیں۔ مجھے کوئی آدمی تو نظر نہیں آیا لیکن گولیاں لگا تار چل رہی تھیں۔ کچھ گولیاں تو جنگلے کے تختے چیر کر بنگلے تک ہی تھیں۔ لیکن اس سب کے باوجود بچے ذرہ برابر بھی خوفزدہ نہیں ہوئے۔ وہ اس سب کو اپنے بلند بانگ قبضوں

میں اڑا رہے تھے۔ گزشتہ شب بوند باندی ہوئی تھی اور موسم قدرے سرد ہو گیا تھا، اس لئے میں نے بچوں سے اچھی طرح کپڑے پہن کر آنے کو کہا۔ میرے دونوں بیٹے سات سالہ سریش اور بارہ سالہ ویمل جلدی سے دوبارہ برآمدے میں آگئے۔ ایک نے صرف 'بش شرٹ' پہن رکھی تھی اور دوسرے نے سویٹر۔ لیکن آپادھانی اور جلدی کی وجہ سے وہ جوتے پہننا بھول گئے تھے۔ چاروں کی چاروں لڑکیاں بھی تماشہ دیکھنے کے لئے باہر نکل پڑی تھیں جن میں میرے شوہر کی ایک بھتیجی بھی تھی۔ وہ ہمارے پاس سری نگر میں رہنے کے لئے آئی تھی اور وہیں سے مظفر آباد آگئی۔ وہ تقریباً چودہ سال کی تھی اور ہم اُسے 'سویدش' کہا کرتے تھے۔ میری سب سے بڑی بیٹی 'وینا' ساڑھے چودہ سال کی تھی 'شیل' دس سال کی تھی اور سب سے چھوٹی 'کملیش' نو سال کی تھی۔ یہ سب محصوم بچے فائرنگ کی آواز سن کر قہقہے لگاتے اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میں نہیں جانتی کہ کیوں۔ لیکن میں بھی اس صورتِ حال سے کوئی زیادہ پریشان نہیں تھی۔ تاہم جب دیکھا کہ فائرنگ کم ہونے میں نہیں آرہی تو مجھے بچوں کو اندر چلے جانے کے لئے کہنا پڑا۔ لیکن وہ میری بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھے بلکہ اُلٹا مجھے بزدل اور کمزور دل کہہ کر چھیڑنے لگے تھے۔

ہم ابھی برآمدے ہی میں تھے کہ پولیس کا ایک سب انسپکٹر تیس (23) سپاہیوں کو ہمراہ لے کر میرے شوہر کے پاس ہمارے صحن میں آگیا۔ سپاہیوں میں بیس مسلمان تھے اور تین ہندو تھے۔ البتہ سب انسپکٹر ایک ہندو راجپوت تھا۔ اُس نے وزیر وزارت (میرے شوہر) کو مطلع کیا کہ حملہ شروع ہو چکا ہے۔ دشمن پہلے ہی دریائے کشن گنگا (نیلیم) کا پل عبور کر چکا ہے اور اب شہر میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب میرے شوہر اندر آئے تو میں نے پوچھا کہ "آپ دو میل جا کر فوج کو کیوں نہیں بلا لیتے؟" "فائرنگ میں کمی آجائے تو میں دو میل جاتا ہوں"۔ انہوں نے کہا۔

یہ وہ لمحات تھے جب میں نے انہیں آخری بار دیکھا۔ جب وہ باہر جانے لگے تو انہوں نے بچوں کو دیکھ کر ہنسنے کی کوشش کی۔ "کیا تم آج انہیں چائے نہیں پلاؤ گی؟ ذرا ان کی طرف دیکھو تو سہی وہ ذرہ بھر بھی گھبرائے ہوئے نہیں ہیں اور بالکل لا پرواہ نہیں۔ وہ بہت اہم اور اعلیٰ بچے ہیں مجھے اعتراف کرنا چاہیے۔" ہاں وہ بالکل خوش تھے۔

جب میں نے دوبارہ اُن کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تو وہ جا چکے تھے اور پھر..... اُسکے بعد کبھی لوٹ کر واپس نہیں آ سکے۔

جب فائرنگ شروع ہوئی تو زیادہ تر ملازمین گھر میں نہیں تھے۔ صرف ایک ادم پرکاش جو پرانا

اور وفادار ملازم تھا ہمارے ساتھ تھا۔ گھبرائے ہوئے لوگ سارے شہر میں دوڑ بھاگ کر رہے تھے۔ وہ رورہے تھے اور بن کر رہے تھے۔ اس دلدوز منظر کو دیکھ کر ہم بھی گھبرا گئے۔ اسکے فوراً بعد ایک شخص آیا جس نے اعلان کیا کہ حملہ آوروں نے ہسپتال کو آگ لگا دی ہے۔ اور وہ ہر اُس چیز کو جو ان کے سامنے آتی جا رہی ہے آگ لگا رہے ہیں۔ بے بس اور بے یار و مددگار مریض زندہ جلائے جا رہے تھے۔ یہ منظر انتہائی خوفناک تھا۔ ہسپتال ہمارے بنگلے سے بالکل قریب تھا۔ ایسے میں میں بچوں کو لے کر اندرون خانہ ایک کمرے میں چلی گئی۔ ہمارا باورچی خانہ بنگلے کے عقب میں تھا اور اس سے ذرا اور پیچھے ہماری ایک چھوٹی سی زیارت بھی تھی۔ یہاں سے ایک دروازہ مسلمانوں کی زیارت کی طرف کھلتا تھا۔ کسی اچانک جذبہ کے تحت میں نے اپنا تمام زیور اتار کر ایک بنڈل میں باندھ لیا۔ کپڑے جو میں نے پہن رکھے تھے پرانے تھے اور مجھے گرم رکھنے کے قابل نہیں تھے لیکن عین اُس لمحے وقت کی کمی کے باعث میں مزید کپڑے پہننے کے قابل بھی نہیں تھی۔

میں جوں ہی اندر گئی تو کسی نے چیخ کر کہا پولیس سپرینٹنڈنٹ کے بنگلے کو آگ لگ گئی ہے اور اُس سے شعلے لپک رہے ہیں۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اب میں کیا کروں۔ عین اُس وقت میں نے اپنے ایک مسلمان چہر اسی کو دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے سنا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اور چیخ چیخ کر مجھے کہہ رہا تھا۔ ”آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ حملہ آور آپ کے بیڈروم تک پہنچ چکے ہیں اور آپ یہاں ٹھل رہی ہیں۔ وہ لوگ تقریباً ساٹھ کی تعداد میں ہیں۔ کیا سُن رہی ہیں؟ اپنے بچوں کو لے کر گھر سے باہر نکل آئیں۔ ہم انہیں زیارت کے راستہ میں کسی جگہ چھپا دیں گے۔“

میں بالکل دم بخود اور سر اسیمگی کی حالت میں تھی۔ ”مہتاجی کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ٹھیک ہیں اور آگے چلے گئے ہیں۔ مہربانی کر کے جلدی کریں۔“

میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کیونکہ میرے شوہر اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کے سلسلہ میں باہر تھے اور مجھے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ اُن کی غیر حاضری میں میرا گھر چھوڑنا کوئی اچھی بات ہے۔ چہر اسی میرے اس رویے پر بے صبر ہوا جا رہا تھا۔

”مہربانی کر کے جلدی کریں کیونکہ ذرا بھر بھی دیر ہوئی تو ہمارے لئے کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ وہ ہر طرف آتش زنی اور قتل و غارت کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔“ میں زیادہ دیر ایسی حالت میں نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ جلدی سے میں نے بستر کی ایک چادر اور گپتی (تلوار کی طرح کی لاٹھی) اٹھائی اور بچوں کو لے کر بنگلے پاؤں باہر نکل آئی۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا سب وہیں چھوڑ دیا۔ میں نے گپتی اس لئے اٹھائی تھی کہ اگر آبروریزی



کا خطرہ ہوا تو میرے بچے اس کی مدد سے اپنے آپ کو ہلاک کر سکیں گے۔

ہم زیارت کی طرف چلتے گئے۔ لمحہ بھر کے لئے میں نے پیچھے مڑ کر اپنے گھر پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی جو پہلے ہی تنہائی اور ویرانی کا مجسمہ دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے شکر گزاری کے انداز میں سوچا کہ میں نے اس میں کتنی آرام دہ زندگی گزاری ہے۔ لیکن اب تنہائی میں ڈوبی ہوئی اس رہائش گاہ پر تاریکی کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ شاید یہ اُس انجانے مستقبل کی علامت ہے جو ہمارے مقدّر میں لکھا جا چکا ہے۔

فائرنگ جاری تھی اور یہ کانوں کو سُت کر رہی تھی۔ ہم سارا راستہ لڑکھڑاتے اور ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے۔ کیونکہ ہماری ذرا سی غلطی سے ہم سب گدو گدو کی غذا بن کر رہ جاتے۔

اب موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ہم آگے چلنے کے قابل نہیں تھے اس لئے گھاس پر آرام کرنے کی غرض سے ٹھہر گئے۔ ہمارا سارا جسم بھیگ چکا تھا اور بچے سردی سے کانپنے لگے تھے۔ میں نے انہیں بستر کی چادر میں لیا اور وہ بیچارے گٹھڑی کی طرح اس کے نیچے آ گئے۔

ایسا لگتا تھا کہ ہم فائرنگ والی جگہ کے بالکل قریب پہنچے ہوئے ہیں۔ میں انتہائی سنسنی اور اداسی کے عالم میں غرق تھی۔ ہمارا ایک پرانا ملازم ہسپتال سے دوڑتا ہوا میری طرف آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم بات ہوگی۔

میں نے اُس سے پوچھا ”تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟“

میرا بارہ سالہ بچہ ہسپتال میں تھا وہ اب آگ میں جل رہا ہے۔ سارے کے سارے مریض جل کر راکھ ہو رہے ہیں۔ سب زندہ جلائے جا رہے ہیں۔ ادھر میرے خدا! میں اپنے چھوٹے بچے کو کہاں سے لاؤں گا؟“

وہ ہسپتال کی طرف دوڑ پڑا۔ بعد میں ہمیں اس ساری کہانی کا پتہ چلا کہ اُس بیچارے کی اپنی لاش ہسپتال کے قریب سے ملی جبکہ اُس کے ہاتھوں میں اپنے بچے کی جلی ہوئی لاش بھی تھی۔

ہم تقریباً ڈھائی گھنٹے تک وہاں پڑے رہے۔ سردی اتنی تھی کہ بچے زرد پڑ گئے تھے۔ اُسی اثنا میں اوم وہاں پہنچ گیا۔ وہ سارا وقت ہمیں تلاش کرتا رہا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔

”تم کہاں چلے گئے تھے اوم؟ اور تم رو رہے ہو؟“

بچے اُسے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور اُسے بھی خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”ہیلو اوم! تم اتنے کمزور دل ہو؟ دیکھو ہم بالکل ڈرے ہوئے نہیں ہیں۔ کیا تم ہمیں نہیں بتایا کرتے

تھے کہ تم کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔ اور اب تم اپنی بات بھول گئے ہو؟“

لیکن اوم نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اُس سے دوبارہ پوچھا۔

”کیا تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ کیا ہوا ہے۔ اور اوم! تم رو کیوں رہے ہو؟“

بولنے سے پہلے وہ ذرا سا جھجکا ”میں ابھی تک بنگلے کے اندر ہی تھا جب آپ لوگ کہیں نکل آئے۔ کوئی ساٹھ کے قریب قبائلی دروازے توڑ کر گھر کے اندر داخل ہو گئے اور سارا زیور اور کپڑے وغیرہ اٹھا کر چلے گئے۔“

”کیا تم صرف اس لئے رو رہے ہو؟ بھائی! یہ کپڑے اور جیولری وغیرہ ہم نے بنائی تھی اور اگر ہم زندہ رہے تو ہم یہ چیزیں دوبارہ بنالیں گے۔ لیکن کیا تم مجھ پر ایک مہربانی کرو گے؟ کیا تم بنگلے پر جا کر صاحب کا گرم سوٹ لاسکو گے؟ وہ صبح محض واجبی سے کپڑے پہن کر گئے تھے جو گرم نہیں تھے اور اب انہیں سردی محسوس ہو رہی ہوگی۔“

اُس نے گہری سانس لی اور چلا گیا۔ لیکن جلد ہی واپس آ گیا۔

”میں اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں نے کسی کو اندر کراہتے ہوئے سنا ہے۔“ ظاہر تھا کہ وہ اس سے زیادہ نہیں بتانا چاہتا تھا۔

مجھے احساس ہو گیا کہ جو کچھ اُس نے نہیں بتایا وہ اُس سے زیادہ منحوس اور بُرا ہوا ہو گا جو اُس نے بتایا۔ میں نے پیچھے مڑ کر اپنے بنگلے کی طرف دیکھا۔ اچھے خدا! وہ جل رہا تھا۔ چراسی نے بھی جو ہمارے ساتھ ہی تھا بنگلے کو جلتے ہوئے دیکھا۔ ”ادھر دیکھو! تمہارا گھر جل رہا ہے۔“ مکلیش نے چیخ کر کہا۔ ”ماں! میری گڑیا کا گھر بھی جل رہا ہو گا اور ساری بے بس گڑیاں بھی۔ کیا ہم کسی طرح اُن کو نہیں بچا سکتے؟“ معصوم بچی ابھی تک اپنی گڑیوں کی دنیا میں رہ رہی تھی۔

میں اُس گھر کو شعلوں میں لپٹے ہوئے اور دھوئیں کو اوپر اُٹھتے ہوئے دیکھ کر ڈگمگا سی گئی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ میرے شوہر کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟ میں بچوں کو کہاں لے جاسکتی تھی؟ میں سوچ سوچ کر تھک گئی تھی اور میرا ذہن چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ بچے میری طرف دیکھتے تھے لیکن مجھے دیکھنے سے انہیں کسی قسم کا کوئی اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جہلی طور پر میرے ذہن کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

چراسی نے مشورہ دیا کہ ”ماتا جی! ہمیں یہاں سے کہیں اور چلے جانا چاہیے۔ میں آپ سب کو ایک نسبتاً محفوظ جگہ پر لے جاؤں گا ورنہ یہ بچے سردی میں منجمد ہو کر مرجائیں گے۔ اگر حملہ آور یہاں آگئے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہمیں یہ جگہ فوری طور پر چھوڑ دینی چاہیے۔“ یہ ایک افسوسناک اور حوصلہ شکن سوچ تھی کہ ہم سب

کچھ کھو چکے ہیں اور ہم سب مزید مشکلات کا سامنا کرنے والے ہیں۔ اگرچہ ہم یہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ ہمارا مستقبل کیا اور کیسا ہوگا۔ بچے ننگے پاؤں چلتے گئے اور بار بار اپنے جلتے ہوئے گھر کو دیکھتے تھے جواب شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

راستے میں ہم نے دس گیارہ افراد پر مشتمل ایک گروہ دیکھا جو ہماری طرف آرہا تھا۔ انہوں نے سریش جو ہمارے گروہ کی قیادت کر رہا تھا، کوروا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کس کا بیٹا ہے اور وہ کدھر جا رہا ہے۔

حفاظتی نکتہ نظر سے یہ بتانا ٹھیک نہیں تھا کہ وہ وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) کا بیٹا ہے لیکن اُسے ہمیشہ بچ بولنے کی تربیت دی گئی تھی اس لئے وہ یہ بھی نہ چھپا سکا۔

”اوہ ہاں۔ پھر جلدی کیجئے جناب۔ وزیر صاحب نے آپ سب لوگوں کا نوابہ کے گھر ٹھہرنے کا انتظام کیا ہے۔“ نوابہ تحصیل کا چہرہ اسی تھا اور ہم سب کو یہ کرنا تھا کہ گرتے پڑتے کسی طرح اُس کے گھر تک پہنچ جائیں۔ اُس کا گھر ہمارے گھر سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر تھا اور ایک بلند ٹیلے کی چوٹی پر واقع تھا۔ وہاں سے ہو کر باقی شہر کا بھی اچھی طرح نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ اُس کے کنبے اور دیگر مسلمانوں نے جو اُس کے ہاں پناہ لئے ہوئے تھے، ہمارا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ انہوں نے کہا۔ ”آپ ہمارے آفیسر کی شریک حیات ہیں۔ ہم آپ کی بھی اتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی اُن کی۔ مہربانی کر کے آپ اسے اپنا گھر سمجھیں اور کسی قسم کا کوئی تکلف نہ کریں۔“ جب میں گھر کے اندر داخل ہوئی تو گھر کی خواتین میرے بچوں کی حالت زار پر روئے بغیر نہ رہ سکیں۔ میں نے اُن سے ”مہتاجی“ کے بارے پوچھا۔ لیکن ایسا لگا کہ وہ غالباً اُس تصور ہی سے بے نیاز ہیں کہ اُن کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا۔

اسکے فوراً بعد شیوا دیال جو پولیس سپرینٹنڈنٹ کا اردلی تھا، وہاں پہنچ گیا۔ اُس کا تعلق بارہ مولہ سے تھا اور وہ اکثر ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔ اُس نے اوم کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے کچھ علم ہے کہ مہتاجی کہاں ہیں؟۔

”مہتاجی میرے صاحب (سپرینٹنڈنٹ پولیس) کے ساتھ ہائی سکول کی طرف گئے تھے۔ وہ فوج کے سپاہیوں کے زرخے میں محفوظ ہوں گے۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے ایک توپ (بڑی گن) بھی نصب کر لی ہوئی تھی۔“ اُس نے مجھے کچھ اس طرح کی کہانی سنائی۔

بچے سردی سے کانپ رہے تھے۔ نوابہ کی بیوی نے آگ جلائی جس پر میں نے بچوں کے کپڑے

خشک کیے۔ آسمان دھوئیں کے بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دُنیا ختم ہونے والی ہے۔ اڑوس پڑوس کے لوگ اپنا سب کچھ کھو چکے تھے اور بہت سے اب بھی قطار در قطار پناہ لینے کے لئے نوابہ کے گھر کی طرف آرہے تھے۔ میں اپنے شوہر کے بارے پوچھ پوچھ کر مایوس ہو چکی تھی۔ میں نے ہر شخص سے پوچھا کہ اُسے کچھ علم ہو۔ اُن سب کی اطلاعیں متضاد تھیں۔ میں نے سنا تھا کہ حملہ آور مردوں کو قتل کر دیتے ہیں اور عورتوں کو اغواء کرتے ہیں۔ اور گھروں کا صفایا کرنے کے بعد انہیں محض کھیل تماشا کے طور پر آگ لگا دیتے ہیں۔

شام کے تقریباً چار بج چکے تھے اور بچوں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ انہیں بہت بھوک لگ رہی تھی۔ خاتون خانہ نے مکئی کی ایک روٹی پکائی جو میں نے بچوں کو دی۔ میں نے پہلے اُس کے چھ ٹکڑے کئے اور پھر اُن میں تقسیم کر دی۔





# آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا

ہم رات دس بجے تک بیٹھے رہے۔ جب نوابہ گھر کے اندر آیا تو اُس نے اپنی بیوی کو الگ بلا کر اُسکے کان میں سرگوشی کی اور جب وہ واپس ہمارے پاس آئی تو اُس نے اعلان کیا کہ ہمیں اُس کا گھر فوری طور پر چھوڑنا ہے۔ ”مجھے افسوس ہے لیکن آپ یہاں مزید نہیں ٹھہر سکتیں۔ حملہ آور یقیناً یہاں آئیں گے اور پھر آپ کو یہاں پناہ دینے کی وجہ سے ہم سب قتل کر دیئے جائیں گے۔“

”لیکن میں اس اندھیری رات میں کہاں جا سکتی ہوں جبکہ میں یہاں کسی کو جانتی بھی نہیں ہوں۔“ لیکن اُس نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ اُس کے شوہر نے بھی اُس کی آواز میں آواز ملائی اور کہا ”مہربانی کر کے فوراً یہاں سے نکل جائیں۔ دونوں وزیر صاحب اور سپریٹنڈنٹ پولیس ایک جیپ پر بیٹھ کر اوڑی کی طرف نکل گئے ہیں۔ ہم آپ کو یہاں نہیں رکھ سکتے۔“

میں نے محسوس کیا کہ یہ جھوٹ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات کسی بھی صورت میں سچ نہیں ہو سکتی۔ وہ ہمیں چھوڑ کر اس طرح بھاگ نہیں سکتے۔“ لیکن نوابہ نے قرآن کی قسم کھا کر کہا اور زور دے کر کہا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

صبح سویرے دن چڑھتے وقت جب میں اُن کے ہاں پہنچی تھی تو انہوں نے بڑے اشتیاق سے مجھے پناہ دینے کی پیشکش کی تھی۔ بلکہ میری بے حد عزت افزائی بھی کی تھی۔ اب رات کے وقت وہ مجھے گھر سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔ اُن کے اس روئے نے فطری طور پر میری حوصلہ شکنی کی اور میں بہت بددل ہوئی۔ میں جانتی تھی کہ میں بے بس ہوں اور کچھ بھی نہیں کر سکتی۔

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے پناہ دینے سے آپ کو خطرہ ہے تو میں ہر حال میں چلی جاؤں گی۔ میں آپ کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ میں چلی جاؤں گی۔ لیکن اس شرط پر کہ آپ مجھے بحفاظت

میرے چوکیدار کے گھر پہنچادیں“ یہ چوکیدار بھی مسلمان ہی تھا لیکن یہ ایک مہربان آدمی تھا۔ اُس کا گھر تو نوابہ کے گھر سے کافی دُور تھا لیکن نوابہ مجھے وہاں لے جانے پر راضی ہو گیا۔

”ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ جوگیاں کے گاؤں تک جاؤں گا۔ اور گاؤں کا نمبردار آپ کو صبح تک

چوکیدار کے گھر پہنچا دے گا۔“

میں جانتی تھی کہ جوگیاں گاؤں غنڈہ گردی کی وجہ سے مشہور ہے۔ نوابہ کا لہجہ بھی اطمینان بخش نہیں

تھا۔ کیا وہ کسی شرارت پر ٹٹا ہوا تھا؟ میں نے اُم اور شیوا دیال کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ چہر اسی جو بنگلے سے ہمارے ساتھ آیا تھا وہ بھی ابھی تک ہمارے ساتھ ہی تھا۔

پہاڑی راستہ کانٹوں اور پتھروں سے اُٹا پڑا تھا۔ کوئی ایک غلط قدم بھی مہلک ثابت ہو سکتا

تھا، درندوں کی آوازیں بار بار تاریکی کو چیرتی ہوئی سنائی دیتی تھیں۔

ہمیں وہاں سے ہو کر جلتا ہوا قصبہ (مظفر آباد شہر) ہیولے کی شکل میں دکھائی دیتا تھا۔ اور گولیوں

کی دبی دبی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔

میں اپنے چھوٹے سے قافلے میں سب سے پیچھے چل رہی تھی۔ ہم چڑھائی چڑھ کر پہاڑی پر آبادی

میں پہنچے۔ جو آدمی وہاں رہتا تھا وہ نوابہ ہی کا کوئی رشتہ دار نکلا۔ نوابہ نے اُس سے پوچھا ”کیا ہم صبح تک یہاں ٹھہر سکتے ہیں؟“

خوش قسمتی سے اُس آدمی نے انکار نہیں کیا۔ بچے اس قدر تھکے ہوئے تھیکہ وہ ایک بھی قدم آگے بڑھانے کے لئے

تیار نہیں تھے۔ وہ بیچارے اس سارے عرصے میں سردی سے کانپتے رہے۔ یہ مصیبت اس لئے بھی تھی کہ اُن کے

کپڑے ابھی تک گیلے تھے اور اُن کے دانت بج رہے تھے۔

ہمیں ایک بستر اور ایک لحاف دیا گیا۔ بچوں کو کمپی کی ایک بڑی روٹی بھی مل گئی۔ پہلے تو مجھے محسوس ہوا

کہ مجھے روٹی کی پیش کش قبول نہیں کرنی چاہیے لیکن جب میں نے بچوں کی آنکھوں میں بھوک دیکھی تو میں نے

مجبور ہو کر اسے قبول کر لیا۔ میں اس کے علاوہ کچھ بھی کیا سکتی تھی؟ کھانے کے بعد وہ سب سو گئے۔ میں بھی اُن کے

نزدیک لیٹ گئی۔ لحاف بے حد غلیظ تھا۔ اچھے دنوں میں ہم نے نہ صرف یہ کہ اسے بہت دُور پھینک دیا ہوتا بلکہ

اُس جگہ پر جراثیم کش دوا بھی پھینکی ہوتی۔ لیکن آج ہم اس کے لئے بھی بے حد شکر گزار تھے۔

میں نے کمرے پر چاروں طرف نظر دوڑائی کئی تیز دھار نیزے بھالے دیوار پر لٹک رہے

تھے۔ جس کی وجہ سے میں گھبراہٹ ہو گئی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا جب باہر سے سرگوشیوں کی آواز آنے لگی۔ میں

نے دروازہ کھول کر تاریکی میں دیکھا۔ تین آدمی ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کر رہے تھے اُن میں سے ایک نوابہ تھا لیکن دوسرے دو آدمیوں کو میں نہیں پہچان رہی تھی۔ اُن میں سے ایک آدمی کے پاس ایک تیز دھار نیزہ بھی تھا جبکہ تیسرے کے پاس ایک کلہاڑا تھا۔ میں نے ہمت کر کے اُن سے پوچھا کہ ”آپ کیا سرگوشیاں کر رہے ہیں؟“

نوابہ اُچھل کر سامنے آگیا اور کہنے لگا:

”مجھے ڈر ہے کہ آپ کو یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑے گی۔ کیونکہ صبح تک حملہ آوروں کے یہاں آنے کا خطرہ ہے اور پھر وہ آپ کو یہاں پناہ دینے کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی قتل کر دیں گے۔ کیا آپ یہ بات سمجھتی ہیں؟ اس لئے یہ جگہ بھی فوراً چھوڑ دیں۔“

اُس کے ان الفاظ نے میرا سر چکرادیا۔ میں نے صبح سے پانی کا ایک قطرہ تک نہیں پیا تھا۔ میری بد قسمتی اور بد حالی کہیں ختم ہونے والی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ لوگ میری وجہ سے نقصان اُٹھائیں۔ میں نے وہ جگہ بھی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن میں اس جگہ کے گرد و نواح کے بارے کچھ بھی نہیں جانتی تھی اور اگر وہ بھی کہیں اور جانے کے سلسلہ میں میری راہنمائی نہ کرتا تو میں کیا کر سکتی تھی؟

”ایسا کرنا ابھی میرے بس میں نہیں کیونکہ میرے بچے گھر میں اکیلے ہیں۔ لیکن اگر آپ چائیں تو میں آپ کو ایک گائیڈ (راستہ دکھانے والا) مہیا کر سکتا ہوں جو آپ سے بیس روپے لے گا۔“

”ارے بھائی! میرے پاس تو اس وقت بیس پیسے بھی نہیں۔“

لیکن نوابہ کے پاس کوئی اور تجویز نہیں تھی۔

”آپ کے پاس اگر کچھ نہیں ہے تو اس سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ جب تک آپ اُسے بیس روپے

نہیں دیں گی تو وہ آپ کے ساتھ نہیں جائے گا۔ اب یہ آپ تک ہے کہ آپ روپے کا انتظام کریں۔“

روپے کیسے تلاش کیے جائیں! ہمارے پاس تو بالکل کچھ نہیں تھا جبکہ نوابہ نے سنگ دلی سے اعلان

کیا ”پھر میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ فوری طور پر یہاں سے نکل جائیں۔“

ایک جھٹکے سے میرے ذہن میں زیورات کا خیال آیا۔

”یہ دیکھو“ میں نے ایک بالی اُس کو دکھائی۔ ”کیا اس سے کام چل جائے گا؟“ وہ اس امکان پر خوش

تھا اور اُس نے ایک آدمی کو باہر بھیجا۔

”مہربانی کر کے یہ اُس کو دے دیں۔“

میں نے انکار کیا۔ ”نہیں۔ ابھی نہیں۔ جوں ہی ہم اپنی منزل پر پہنچیں گے۔ تو یہ اُسے مل جائیگی۔“ اگر وہ چاہتے تو وہ آسانی سے ہر چیز ہم سے چھین سکتے تھے اور اُس کے بعد ہمیں گھر سے بھی نکال سکتے تھے۔ لیکن شاید اُس وقت اُن کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ ہمارے پاس کچھ اور زیور بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے بچوں کو جگایا۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ”پیارے بچو! تیار ہو جاؤ۔ ہمیں یہ جگہ چھوڑنی ہے۔ لیکن تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“

ہمارا نیا گائیڈ ہمیں راستہ دکھانے لگا۔ ہمیں تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارنا پڑ رہی تھیں۔ راستہ پہاڑی بھی تھا اور کانٹوں اور پتھروں سے اُٹا ہوا تھا۔ جب ہم تھوڑا سا آگے گئے تو میں نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ ایک سکھ لڑکا جس کے ہاتھ میں ٹارچ روشن تھی۔ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ہمارے قافلے سے ایک آدمی نے اشارہ کیا۔

لڑکے نے ایک مشہور سکھ کا نام لیا اور کہا کہ ”وہ اس راستے سے اپنی فیملی کے ساتھ گزرا تھا جب اُس کا دس سالہ بیٹا پھسل کر یہاں گر اٹھا اور زخمی ہو گیا تھا۔ اُس کی حالت بہت خراب ہے بلکہ قریب المرگ ہے۔ اس لئے آپ لوگ اپنے بچوں کے بارے میں محتاط رہیں۔“ وہ جلدی میں تھا اس لئے چلا گیا اور جب وہ چلا گیا تو ہم دوبارہ تاریکی میں ڈوب گئے۔

جلد ہی ہم ایک دوسرے سے الگ کر دیئے گئے اور میں بہت بد دل اور مایوس ہو گئی۔ شیوا دیال میرے پاس آیا اور کہا۔ ”میں دوسروں سے ذرا آگے نکل گیا تھا جہاں میں چند ہندوؤں سے ملا ہوں۔ مظفر آباد کا ایک مشہور رئیس بھی اُن کے ساتھ ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اگر ہم محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے مسلمان گائیڈ کو واپس بھیج کر اُن کے ساتھ شامل ہو جائیں۔“ شیوا دیال اس تجویز سے متفق تھا اور میں بھی۔ میں نے گائیڈ سے کہا کہ وہ واپس چلا جائے اور جا کر اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرے لیکن میں اُسے وہ بالی دینا نہیں بھولی جس کا میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا۔ وہ اُسے لے کر بہت خوش ہوا اور جب اُس نے ہمیں الوداع کہا تو اس کی آنکھوں میں اُداسی تھی۔

اس طرح ہم ایک دوسرے گروہ میں شامل ہو گئے جو ہم سے آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں ایک شخص چل کر میرے پاس آیا۔ لگتا تھا کہ وہ میرے چھوٹے بیٹے کے بارے میں پریشان ہے۔ اسی لئے اُس نے اُسے اٹھا کر چلنے کی پیش کش کی۔ بیچارہ بچہ ہماری اس ’مزرگشت‘ کی وجہ سے تھک کر پُور ہو چکا تھا۔

بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچے جسے 'بوتھا' کہتے تھے جہاں ہم نے گوردوارہ میں قیام کیا۔ ہم سے پہلے بھی بہت سے لوگ وہاں پہنچ چکے تھے لیکن ہم اندھیرے میں اُن کو پہچان نہ سکے۔  
جوں جوں رات کی گھڑیاں بیت رہی تھیں، لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے نکل رہے تھے لیکن کسی نے بھی ہمیں اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میں نے اُن لوگوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جو ہمیں یہاں لے کر آئے تھے لیکن سب اس قدر اپنے اپنے مسائل کا اس قدر شکار تھے کہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔

میں شیوا دیال کی طرف مڑی۔ "شیوا دیال! کیا کسی محفوظ مقام پر پہنچنے سے پہلے تم ہمیں ذلیل و خوار نہیں ہونے دو گے۔ کیا تم ایسا کرو گے؟" اس وقت تک میں بے حد مایوس ہو چکی تھی۔  
لیکن اُس کا جواب انتہائی جذباتی تھا۔ "ماتا جی! جب تک میں زندہ ہوں میں آپ کو اور بچوں کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ مہربانی کر کے مجھ پر اس قدر بھروسہ ضرور کریں۔"  
اس کے جواب سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں خوش ہو گئی۔ "ٹھیک ہے۔ ہمیں مزید یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے، وہ صبح تک یہاں ضرور آئیں گے اور گردوارہ بھی جلا دیں گے۔ اب ہمیں کہیں اور چلے جانا چاہیے۔" میں نے تجویز دی۔

جانے کے لیے ہمارے پاس کوئی بھی جگہ نہیں تھی اور نہ ہی ہمیں کسی راستے کا پتا تھا۔ لیکن وہاں ٹھہر کر خطرہ مول لینا بھی کسی حماقت سے کم نہیں تھا۔ اس مایوسی اور بے صبری کے عالم میں ہم نے جو راہ سامنے آئی پکڑ لی اور نکل کھڑے ہوئے۔ اور اُس منزل کی طرف چل دیئے جس کا ہمیں کوئی علم نہیں تھا۔ صبح کی پہلی کرنیں نمودار ہوئیں تو ہم نے دیکھا کہ آگے والے راستے پر سیدھی چڑھائی ہے۔ جو شاید کسی پہاڑی کی طرف جا رہا ہے۔ مزید یہ کہ ذرا آگے ہمیں لوگوں کا ایک اور گروہ نظر آیا جو لاٹھیاں لیے کھڑا تھا۔ وہ آگے آئے اور ہم سے پوچھا "آپ سب لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم اپنے چوکیدار کے گاؤں کی طرف جا رہے ہیں۔"

انہوں نے ہمارا رستہ روک لیا اور اُن کے ترجمان نے سختی سے اعلان کیا۔ "آپ ایک بھی قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ حکومت کا حکم ہے کہ اس راستے سے کوئی نہیں گزر سکتا۔" ہم نے اس اُمید میں انتظار کیا کہ شاید ہم انہیں قائل کر کے یہاں سے گزر سکیں۔ وہ مظفر آباد ہی کے کسان تھے اور اُن کی آنکھیں خون کی پیاسی دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ خدا کی خاص مہربانی تھی کہ وہ ہمیں قتل کرنے سے باز رہے۔ چنانچہ ہم واپس



پہاڑی کے نیچے کی طرف چلنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم جو تھوڑا بہت حاصل کر سکتے تھے وہ سب اکارت چلا جائے گا۔ اب ہر قدم ایک آزمائش معلوم ہو رہی تھی۔ ہم سب بڑی طرح تھکے ہوئے تھے اور بچے سردی سے نیلے پیلے ہو رہے تھے۔

پہاڑی ڈھلوان سے نیچے اترتے ہوئے ہمیں ایک بوڑھا آدمی ملا جو مسلمان تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”دادا! میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی اگر آپ ایک آدھے گھنٹے کے لیے ہمیں اپنے گھر میں آرام کرنے کی اجازت دے دیں۔ میں بچوں کو آگ کے پاس بیٹھا کر گرم کرنا چاہتی ہوں۔“ یہ بوڑھا غریب کسان انتہائی مہربان نکلا اور ہمیں گھر لے گیا۔ یہ جگہ مظفر آباد سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر تھی۔ اُس کے گھر کے سامنے ایک برآمدہ تھا اور اندر کمرے میں چند گائیں اور بھینسیں ایک طرف باندھی ہوئی تھیں۔ ایک دوسرے کونے میں ایک چولہا تھا اور ایک کھوٹی کے ساتھ تلوار لٹک رہی تھی۔ اُس بوڑھے آدمی کی ایک بیوی، دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ وہ ہمیں اندر لے آیا اور بڑی حلیمی سے ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ پھر اُس نے اپنی بیوی سے ہمارا تعارف کرایا اور کہا کہ ”یہ ہمارے مہمان ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کی حفاظت بھی کریں اور احترام بھی۔ ذرا دیکھو! یہ کتنی مصیبت میں ہیں۔“ اُس نے خدا سے ہمارے لیے رحم کی دعا بھی کی۔

بچے دوڑ کر جلتے ہوئے چولہے کے پاس چلے گئے۔ اور آگ کے ارد گرد ایک دوسرے سے چمٹ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے بے حد رغبت سے اپنے ہاتھوں کو گرم کیا۔

عین اُسی وقت یہ راز بھی کھلا کہ اُس کسان کا ایک بیٹا میرے بڑے بیٹے کا ہم جماعت ہے۔ کسان کا نو جوان بیٹا دوڑتا ہوا اپنے باپ کے پاس گیا اور لڑکے نے بڑے فخر سے اعلان کیا کہ اس کا ہم جماعت وزیر (ڈپٹی کمشنر) کا بیٹا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ اُن دونوں معصوم بچوں کی بے ریا خوشی کتنی صحت افزاء معلوم ہو رہی تھی۔ خاتون خانہ ہمیں کھانے پینے کے لیے کچھ دے کر اپنے کسی کام میں مصروف ہو گئی۔ اُس نے چائے بھی بنائی اور مکئی کی روٹی بھی تیار کی۔ ہمیں مکئی کے بھنے ہوئے دانے بھی پیش کیے گئے۔ مجھے زیادہ بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس لئے میں نے صرف تھوڑے سے بھنے ہوئے دانوں ہی پر اکتفا کیا۔ ٹھہرنے کے لئے جگہ، کھانے کے لئے غذا اور بچوں کی خوشی میسر آ جانے پر مجھے بے انداز خوشی ہوئی۔

خاتون خانہ نے مجھے پوچھا کہ کیا میں اس کا پکایا ہوا کھانا پسند کروں گی یا خود پکاؤں گی۔ میں نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔ میں وہی کھاؤں گی جو آپ نے پکایا ہو گا لیکن اس وقت فوری طور پر میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ میرے بچے البتہ کھانا ملنے پر بہت خوش ہوں گے۔“ جو کچھ اُن کے پاس تھا وہ لے آئے اور کھانا

پکایا۔ وہ کافی غریب تھے اور ان کے ہاں زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ بچے ماحضر ہی پر بہت خوش تھے۔ انہوں نے بعد میں ایک چار پائی بھی دی جو میں نے اپنے بچوں کے ساتھ شیر (Share) کی۔ ہم اتنے تھکے ہوئے تھے کہ ہمارے جسم بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے جیسے اُن میں جان تک نہ ہو۔

لیکن امن ہمارے نصیب میں نہیں تھا۔ اب پھر باہر کچھ آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ کسی نے کہا کہ حملہ آور کہیں نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ میں نے شیوا دیال کو جگایا اور اُسے کہا۔ ”اگر حملہ آور آجائیں تو قبل اس کے کہ میری بیٹیوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہو تم اُس تلوار سے جو سامنے دیوار پر لٹک رہی ہے ایک ایک کر کے انہیں قتل کر دو۔“ لڑکیاں جو یہ سب کچھ سن رہی تھیں اپنے قتل ہونے کے امکان پر ذرہ بھی خوفزدہ نہیں ہوئیں۔ بلکہ وہ زیادہ پریشان حملہ آوروں کے تصور سے تھیں۔

لیکن ہمارے مقدر میں کچھ اور تھا۔ وہاں بھی پڑوسی اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ ہمارا میزبان ہمیں گھر سے نکال باہر کرے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اُن سب کے لیے تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔ بوڑھے کسان نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اُس کے عقیدے نے غضب کی صورت اختیار کر لی اور اُس نے کہا۔ ”میں کسی بھی شخص کو جس نے میرے گھر میں پناہ تلاش کی ہے گھر سے نہیں نکال سکتا۔ ہمارے دین نے ہمیں یہ نہیں سکھایا۔“ پھر بھی اس کے پڑوسی نہ اُس سے متاثر ہوئے اور نہ ہی اس کی دلیل سے قائل ہو سکے۔ وہ اب بھی بضد تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہمارا میزبان گھر سے کہیں باہر کسی اور جگہ چلا گیا۔ پڑوسیوں نے اس موقعہ کو ضائع نہیں کیا۔ وہ اس کے ایک رشتہ دار نے جلدی سے گھر کے دوسرے افراد سے مشاورت کی اور ہمارے کمرے میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ ہم سب لاشعوری طور پر اُٹھ کھڑے ہوئے اور چار پائی کے پیچھے قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم پر بندوق کا نشانہ باندھ کر اُس نے سنجیدگی سے حکم دیا کہ ”میں کہتا ہوں۔ نکل جاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔“

یہ آدمی فوج میں رہ چکا تھا اور سرحدی صوبوں میں سروس کر چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ بہتر ہے کہ اس مصیبت کا مقابلہ کرتے ہوئے گولی کھالی جائے۔ میں نے اُس سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو اور گولی چلا دو۔ میرے لیے کہیں اور کوئی جگہ نہیں ہے۔“ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس کہیں اور جانے کی بالکل ہمت نہیں تھی۔ اُس نے بہت دھمکیاں دیں لیکن اس کی ہر دھمکی پر میرا جواب یہی تھا کہ اگر وہ چاہتا ہے تو ہمیں گولی مار دے۔ تاہم وہ ہمیں گولی مارنے کے بارے فیصلہ نہ کر سکا۔

پھر اُس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ آپ اپنے بچوں کے ساتھ یہاں رہیں لیکن ان دو آدمیوں کو جانا پڑے گا۔ انہیں یہاں سے جانا ہے۔“

وہ دو آدمی بھی یہاں رہنے سے ڈرتے تھے۔ اس لیے میں نے اُن سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ بہتر ہوگا کہ آپ یہاں سے چلے ہی جائیں اور ہماری وجہ سے کسی مشکل میں نہ پڑیں۔ وہ جانے کے لئے خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ جب وہ بچوں سے الوداع ہوئے تو ان کے گالوں سے آنسوؤں رواں تھے۔ اوم نے وہ گہتی سنبھال لی جو میں اپنے ساتھ لائی تھی۔

اس روز ہم اسی گھر میں رہے۔ بچوں کو گزشتہ اٹھتالیس گھنٹوں کے دوران کھانے کو کافی خوراک نہیں مل سکی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر پُر اثر اور جگر سوز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے تھے۔ میں نے انہیں مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔ ”میرے بچو! کیا میں اکثر پرانی لوک داستانوں سے اپنے قدیم ہیروؤں کی مہمات کی کہانیاں آپ کو نہیں سناتی رہی؟ تم جانتے ہو کہ وہ لوگ عزت و حرمت کو زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ ہمیں بھی ان قدیم آدمیوں کو یاد رکھتے ہوئے اُن کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ لہذا ہر قسم کے حالات میں مسکراتے ہوئے خوش رہنے کی کوشش کرو۔“

گاؤں کے لوگ بالخصوص مرد، لوٹ مار میں اپنا حصہ سمیٹنے کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ گھر میں صرف عورتیں ہی عورتیں رہ گئی تھیں۔ سارا سارا دن صرف حملہ آوروں ہی کے بارے خبریں موصول ہوتی تھیں۔ کہ وہ اب فلاں گاؤں میں ہیں اور ابھی دوسرے ہی لمحہ فلاں میں۔ ہم نے سنا کہ وہ سب کچھ جلاتے جا رہے ہیں اور سب کچھ لوٹ رہے ہیں۔ خواتین خوف سے کانپتی تھیں اور ہر طرف سے اُن کے لیے لعن طعن سنائی دے رہی تھی۔ تاریکی گہری ہو کر رات کا روپ دھار لیتی تھی لیکن کوئی بھی سوتا نہیں تھا۔ ہمارا میزبان بھی اپنے ساتھ کچھ آٹا لے کر واپس آیا جس میں سے اس نے تمام دوستوں کو بھی حصہ دیا۔



# ایک بھائی کی قربانی

آدھی رات کا وقت تھا جب گھر کی مالکہ اپنے کسی رشتہ دار کے ہمراہ ہمارے کمرہ میں داخل ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”اسے میری مجبوری سمجھئے کہ آپ کو یہ گھر فوری طور پر چھوڑنا ہوگا۔ ہم آپ کو مزید یہاں رکھنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔“

یہ خبر میرے لیے کسی صدمہ سے کم نہیں تھی۔ میں نے عاجزانہ سا احتجاج کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ نے ہمارے ساتھیوں کو پہلے ہی بھیج دیا تاکہ ہم یہاں رہ سکیں۔ آپ کے خیال میں اس نازک لمحے میں ان بچوں کو لے کر کہاں جاسکتی ہوں؟ برائے مہربانی ہمیں رات تو گزارنے دیں۔ ہم صبح سویرے کہیں چلے جائیں گے۔“

لیکن وہ میری بات نہیں سن رہے تھے۔ ہماری میزبان کے رشتہ دار نے مشورہ دیا۔ ”ہم آپ کو پہاڑ کی اُس چوٹی تک راہنمائی فراہم کریں گے جہاں ہم گرمیوں میں مال مویشی (ڈھوک) لے جاتے ہیں۔ وہاں اُوپر ایک غار ہے۔ آپ وہاں اپنے بچوں کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ اور جب کبھی ہم سے ممکن ہوا تو ہم آپ کو کھانا بھیج دیا کریں گے۔“ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس پیشکش کو قبول کرنا حفاظتی نکتہ نظر سے کیسا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے مجھے خود رحمی (Self-Pity) کے شدید درد کا احساس ہونے لگا اور میں یہ نہ بھول سکی کہ میں اس مصیبت کی مستحق نہیں تھی۔

لیکن زندگی حیرتوں سے بھری پڑی ہے۔ آدھی رات کے اس سہمے جو کچھ بھی ہوا، اسی دوران ایک نوجوان گھر کے اندر داخل ہوا اور جب اس نے چند لمحوں تک میرے ساتھ بات چیت کی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں بہنے لگے۔ ”میں آپ کو اپنی بہن کی طرح دیکھتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اور مجھے یقین ہے کہ میں ہر قسم کی تکلیف برداشت کر کے آپ کا خیال رکھوں گا۔“ میں اس اجنبی کے جذبات کے بے ساختہ اظہار سے بے حد



متاثر ہوئی۔ کسی جتلی جذبے کے تحت میں نے اپنے دوپٹے سے کپڑے کا ایک ٹکڑا پھاڑا اور اسے اس کی ہتھیلی پر باندھ دیا۔ کپڑے کا یہ ٹکڑا راکھی (Rakhi) سے قریب ترین چیز تھا۔ جس کا اس وقت میں اہتمام کر سکی۔ جب کبھی عورت کسی مرد کی ہتھیلی کے گرد راکھی باندھتی ہے تو وہ روایتی طور پر پابند ہو جاتا ہے کہ اُس عورت کی بہن کی طرح حفاظت کرے اور اسکے لیے قربانی دے جو بہن کی حیثیت سے اُس کا حق ہے۔ اس رسم کی تکمیل کرتے ہوئے میں نے اپنی چھوٹی انگلی سے تھوڑا سا خون نکال کر اس کی پیشانی پر تلک بھی لگایا۔ اس سب کے دوران وہ بالکل خاموش رہا اور میں نے اپنے آپ کو جذباتی طور پر بلند اور محفوظ محسوس کیا۔

میں نے اُسے وضاحتاً بتایا کہ ”یہ ایک پرانی رسم ہے جو ہمایوں کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے میں آپ کو اپنا بھائی بناتی ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ اس مقدس رشتے کے تقاضوں پر پورا اتریں گے۔ اس نے ہمارے میزبان سے درخواست کی کہ وہ ہمیں صبح تک وہاں رہنے دیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگلے روز وہ ہمیں اپنے گھر لے جائے گا۔ ہماری جلد روانگی کے پروگرام سے مطمئن ہو کر ہماری میزبان نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا تاکہ ہم سکون سے سو سکیں۔

صبح جب میں بیدار ہوئی تو بالکل پڑمردہ سی تھی۔ میں دباؤ کی شدت سے مغلوب ہو کر رونا چاہتی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ میں بار بار اپنے شوہر کے بارہ میں سوچتی ہوں۔ میں اس خیال کو جھٹک کر پرے نہ کر سکی کہ ان کی زندگی خطرہ میں ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ میرے یہ آنسوؤں میرے بچوں کے لیے اچھے ثابت نہیں ہوں گے۔ انہیں ہر قسم کی حوصلہ افزائی اور شاباش، جو انہیں مل سکتی تھی، کی ضرورت تھی۔ لہذا میں نے اپنے قومی کو مجتمع کیا اور جا کر اُن کے پاس بیٹھ گئی۔

ہمارا میزبان صبح کہیں گیا ہوا تھا۔ اُن کا بارہ سالہ بیٹا وقت ضائع کرنے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے اس نے ہمیں گھر سے نکال دیا۔ ”چلے جائیں۔ میں آپ کو اور زیادہ یہاں ٹھہرنے نہیں دوں گا۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔“

باہر کے حالات اور بھی زیادہ خوفناک تھے۔ ہمیں ایسی ایسی کہانیاں سننے کو مل رہی تھیں جنہیں سُن کر دل دہل جاتے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ گاؤں کی ہندو عورتیں آگ جلاتی تھیں اور صاف ستھرا لباس پہن کر مقدس اشلوکوں کا ورد کرتے ہوئے اسی آگ میں چھلانگ لگا دیتیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹجا بموت کو گلے لگاتی تھیں۔ جب حملہ آور آتے اور اس ویرانی کا سامنا کرتے تو اُن سے نہ رہا جاتا اس لیے وہ جلتی ہوئی خواتین کو آگ سے باہر گھسیٹ کر اور جلتی ہوئی لاشوں سے زیورات کو کھینچ کر الگ کرنا شروع کر دیتے۔ باہر یہ سب کچھ



اس وقت بھی ہو رہا تھا جب ہمیں اس گھر سے نکالا جا رہا تھا۔

خوابید حیات کے ساتھ ہم غیر ارادی طور پر چل دیے اور جو بھی راستہ ہمارے سامنے آیا اسی پر چل پڑے۔ ہم ایک پہاڑی پر چڑھے اور دیکھا کہ واقعی چٹانوں کے پیچھے ایک غار موجود ہے۔ میں نے بچوں سے کہا کہ وہ اندر جا کر چھپ جائیں اور دروازے پر بیٹھ کر باہر کی طرف بھی دیکھتے رہیں۔ میں نے یہ غار اس لیے چنا کہ راہگیروں کو میری بیٹیاں نظر نہ آسکیں۔ کوئی ڈھائی گھنٹے گزر گئے۔ ہمیں فائرنگ کی آوازیں بہت قریب سنائی دے رہی تھیں لیکن خوش قسمتی سے ہماری طرف کوئی گولی نہ آئی۔ بہت جلد وہ آدمی جس نے اپنے آپ کو ہماری حفاظت کے لیے وقف کیا ہوا تھا، جسے میں نے گزشتہ روز انتہائی شکریہ کے ساتھ قبول کیا تھا ہماری تلاش میں ادھر آ نکلا۔ بچے اسے دوبارہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ جتلی طور پر اس کی موجودگی میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اعلان کیا اور کہا۔ ”ماں! دیکھو یہ تمہارا بھائی آیا ہے۔“

میرا بھائی چاہتا تھا کہ ہم سیدھے اُس کے گھر چلیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ بڑی حد تک مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ”میں آج صبح حملہ آوروں سے کچھ خواتین کو اپنے گھر پناہ دینے کی اجازت لینے کے لیے دو میل گیا تھا اور انہوں نے اجازت دے دی ہے۔ اب مجھے یہ خوشی ہے کہ میں گھل کر آپ کی مدد کر سکوں گا۔ لیکن اس بارہ میں کوئی علم نہیں کہ حملہ آور کب گھر آجائیں اور سب کے بارہ میں پوچھنا شروع کر دیں۔ ایسی صورت میں میں انہیں کیا بتاؤں؟ اگرچہ ہماری ایک دوسرے سے مشابہت نہیں ہے۔ لیکن کیا آپ محسوس تو نہیں کریں گی کہ میں انہیں یہ بتاؤں کہ آپ میری بہن ہیں جو سیالکوٹ سے آئی ہیں؟ آخر کار کسی نہ کسی طرح ان بچیوں کو بچانا تو ہے۔“ میں اس بات سے فوراً متفق ہو گئی اور شکر گزار بھی ہوئی کہ یہاں ایک مسلمان ایسا بھی ہے جو اپنے دین کے مطابق اخلاقی معیار پر پورا اتر رہا ہے۔

اس کے کنبہ میں سات لوگ تھے۔ دو چھوٹی لڑکیاں، اس کی سوتیلی ماں اس کا باپ، ایک شادی شدہ بہن اور ایک چھوٹا بھائی۔ گھر کے سامنے ایک برآمدہ تھا اور باقی صرف دو کمرے تھے جن میں ایک میں ان کے مولیٰ بندھے ہوئے تھے۔ ہمیں جانوروں کے کمرہ ہی میں ایک بستر فراہم کیا گیا۔ گائے کا خشک گوہر ہر طرف بکھرا ہوا تھا اور اسی پر ایک چٹائی بچھا کر ہمیں سونے کے لیے کہا گیا۔ گوہر کی بو کی وجہ سے میں بیمار ہونے لگی تھی اور اوپر سے ہمیں شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہمارے سانس کی آواز بھی بلند نہیں ہونی چاہیے تاکہ کوئی ہمیں دیکھ نہ لے۔ لیکن بچے پانی لانے کے لیے بار بار باہر جانے سے باز نہیں آ رہے تھے جبکہ یہ خطرہ موجود تھا کہ گاؤں کا کوئی آدمی ہمیں دیکھ لے گا۔

ہمیں اندازہ ہوا کہ حملہ آور مقامی مسلمانوں کو جنہیں سکھوں کی طرف سے حملہ کا خطرہ ہے اکسار ہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے لٹھیوں، نیزوں، کلہاڑوں اور پستولوں کو جمع کر کے اسلحہ خانہ بنایا ہوا ہے۔ یہ خوفزدہ اور وحشی ہجوم گلیوں میں بھوتوں کی طرح گھومتا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بُرے وقت کا انتظار تھا۔

دن گزر گیا اور اندھیرا چھا گیا۔ ہمیں کمرے سے نکل کر برآمدے میں آجانے کی اجازت مل گئی۔ ہمارے میزبان کی بہن پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی کیونکہ اس کا باپ کہیں گیا ہوا تھا اور کافی دیر ہو جانے کے باوجود واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”پیارے! رونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آئیں ہم کچھ توجہ کھانا تیار کرنے پر دیں۔“ وہ اتنے غریب تھے کہ ان کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ فصلیں پک چکی تھیں لیکن کاٹے بغیر کھیتوں ہی میں پڑی ہوتی تھیں۔ آخر کار کچھ آٹا، چاول اور کدّہ کا انتظام کیا جا سکا۔ ان کے بچے بے حد کمزور اور غذائیت کی کمی کا شکار تھے۔ میں جب انہیں باقاعدہ خوراک کی بجائے مکئی کے بھنے ہوئے دانے کھاتے ہوئے دیکھتی تھی تو مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔

گاؤں کے باقی لوگ لوٹ مار میں مصروف تھے لیکن ہمارا میزبان گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ وہ ایک صاف ستھرا اور دیانتدار آدمی تھا اس لیے وہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر لوٹ مار میں حصہ دار نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں اس بے ریا کردار کی دیانتداری کے لیے اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اس کے قلیل وسائل پر بوجھ بن کر اس کی کوئی مدد نہ کر کے اچھا نہیں کر رہی۔ میں نے سویدش اور وینا کو کہا کہ وہ آٹا پیسنے میں اُن کی مدد کریں اور لڑکوں کو کہا کہ وہ مکئی کے دانے الگ کرنے میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ میں خود دھان چھڑنے میں لگ گئی اور مجھے انیمیزبان خاتون کی زبانی زندگی میں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دھان چھڑنے کے لیے اسے پاؤں کے نیچے گچلا جاتا ہے۔ میں نے اس سے قبل اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا ہوا تھا۔ میرے پاؤں مسلسل چلنے سے تھک کر دُکھنے لگے تھے اور اب خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ میں لمحہ بھر کے لیے ماضی میں گزری ہوئی آرام و آسائش کی زندگی کو کو سننے لگی۔ اور مجھے بچوں کے بارے زیادہ ہی ڈر لگنے لگا۔ میں کسی بھی قسم کی جسمانی مشقت کے لیے موزوں نہیں تھی لیکن کیا کرتی بچوں کو کھلانے کے لئے کچھ کمانا تو تھا ہی۔ خاتون خانہ نے جو عین اسی وقت وہاں پہنچی تھی، یقیناً میری آنکھوں میں آنسوؤں اور پاؤں سے خون رستے ہوئے دیکھا ہوگا۔ وہ بہت ہمدرد تھی۔ اس نے کہا۔ ”مہربانی کر کے آپ رہنے دیں۔ میں تمہارے پاؤں میں خون دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتی۔ جب تک ہم یہاں ہیں آپ کو کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میری بیٹیاں بھی وہاں آگئیں اور



ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور انہوں نے فخریہ اعلان کیا کہ ان کا کام ختم ہو چکا۔ میں نے ہاتھوں کی طرف دیکھا جو سُجھے ہوئے تھے اور ہر جگہ سے زخمی تھے۔

کھانا تیار تھا۔ بچوں نے کچھ نہ کچھ کھایا لیکن کھانے کے بعد وہ بھوکے کے بھوکے ہی رہے۔ میں نے بھی تھوڑا سا تلا ہو کدو کھایا۔ گھر کے بچوں کو بھی کھانے کے لیے کافی کچھ نہیں ملا۔ اس کے باوجود وہ خوش نظر آرہے تھے۔ میں اس غریب کسان گھرانے کی رواداری اور صبر و برداشت پر حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی۔

آخر میں ہم سب سونے کی تیاری کرنے لگے۔ کمرہ غلیظ اور متعفن تھا۔ میرا ذہن مستقبل کی مشکلات کے بارے سوچوں سے معمور تھا۔ اس لیے صبح صادق تک نہ سو سکی۔ لیکن اس کے بعد جب مجھے اونگھ آئی تو میں تھکن کے مارے سو گئی۔ بچے مسلسل اپنے باپ کے بارے پوچھتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں انہیں کیا بتاؤں۔ صبح سویرے جب میں جاگی تو گائے میرے بکھرے ہوئے بالوں کو چبا رہی تھی۔ بیچاری گائے کو کیا پتہ اس نے میرے بالوں کو کھینچ کر تقریباً نکال ہی لیا تھا۔

بار بار ایک ہی کہانی دہرائی جاتی تھی۔ بچے بہت بھوکے تھے اور کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ مایوسی میں وہ مٹھیاں بھر بھر کر مکئی کے کچے دانے کھانے لگے۔ میرا سب سے چھوٹا بیٹا بہت بُری حالت میں تھا۔ اُس کے ہاتھ زخمی تھے اور بُری طرح سُجھے ہوئے بھی۔ اُس نے دانوں کو وہیں سے پینا شروع کیا جہاں سے گزشتہ دن چھوڑ گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کام میں زیادہ مصروف ہو کر بے آرامی اور درد سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے رُک جانے کو کہا لیکن وہ نہیں سنتا تھا۔ اُس نے میری مداخلت پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کیا آپ ہی نے ہمیں نہیں بتایا تھا کہ کام کیے بغیر کھانا گناہ ہے؟ ہاں، میں نے ہی اُسے یہ بتایا تھا لیکن اب مجھے بچوں کو قائل کرنے کی کوشش کرنی پڑ رہی تھی کہ وہ فی الحال کام کرنا چھوڑ دیں۔ اسی اثنا میں اس کنبے کی ایک سہیلی خاتون خانہ کو ملنے کے لیے آئی۔ ظاہر ہے کہ اس نے میرے بارے سُنا تو اسی وقت مجھے ایک مفت مشورہ دیا ”اگر تم ان بچوں کو باہر بھیجو تو مجھے یقین ہے کہ لوگ ان پر رحم کھاتے ہوئے کھانے کے لیے انہیں کچھ دے دیں گے۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو تم کوئی ایسا آدمی تلاش کرو جو تمہیں اپنے گھر رکھ سکے۔“ میرا خیال ہے کہ میں جانتی تھی کہ وہ کس طرف اشارہ کر رہی ہے جس کی وجہ سے میرا گلا بند ہونے لگا۔ یہ سادہ لوح خاتون نہیں جانتی تھی کہ اگر کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تو میں اور میری بیٹیاں اپنی جان تک دینے کے لیے تیار تھیں۔ عین اسی وقت میزبان اور اس کا والد اندر آ گئے۔ ان کے چہرے مُرجھائے ہوئے تھے۔ مجھے فکر لاحق ہو گئی اور میں جاننا



چاہتی تھی کہ کیا ہوا ہے۔

اس کے باپ نے جواب دیا۔ ”کچھ پڑوسیوں نے یہاں دیکھ لیا ہے اور انہوں نے قبائلیوں کو مطلع کر دیا ہے کہ ہم نے کچھ ہندو خواتین کو پناہ دی ہوئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اب ہمارے پاس صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے۔ جب حملہ آورا آئیں تو لڑکیاں کلمہ پڑھ لیں اور قسم کھا کر کہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔“

بچوں نے سکول میں کلمہ یاد کیا ہوا تھا اور میں نے میزبان کو بتایا کہ میں بھی کلمہ یاد کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں لیکن جب وقت آئیگا تو مجھے جھوٹ پر قائم رہنے سے متعلق اپنی اہلیت کے بارے شبہ تھا کہ شاید میں اپنے مذہب کے بارے جھوٹ نہ بول سکوں۔

”آج کل وہ ہندو خواتین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اغوا کر رہے ہیں۔“ بوڑھے آدمی نے اختصار کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

کھانے کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ خوف کی وجہ سے ہماری بھوک ختم ہو گئی۔ گھر میں ہر شخص بہت پریشان تھا کیونکہ حملہ آور اس بہانے ہر مسلمان گھر میں داخل ہونے پر اصرار کرتے تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ کہیں گھر میں ہندو عورتیں تو چھپی ہوئی نہیں ہیں لیکن آخر میں گھر کا صفایا کر کے لے جاتے تھے۔ اکثر انہوں نے مسلمان عورتوں کو بھی اغوا کیا۔ یہ تجسّس شام چار بجے تک برقرار رہا جب دو توانا اور مضبوط مسلمان مرد جو ہتھیاروں سے لیس تھے آن پہنچے۔ اُن میں سے ایک تو گاؤں کا نمبر دار تھا اور دوسرے کو دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ ہمارے گھر دو دھ لانے والا تھا۔ میں نے اُسے پہچان لیا لیکن میں نے اُس سے واقفیت پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ اندر آیا اور آکر ہمارے میزبان پر دھونس جمانے لگا کہ وہ ہمیں گھر سے نکال دے۔ حملہ آوروں نے ہمارا مطالبہ کیا ہے۔

انہوں نے ہمیں گھر سے نکال دیا ڈرانے اور ستانے والی اس مخلوق کے ہاتھوں جس کے ظلم کی کوئی انتہا نہیں تھی، ہم چلتے گئے۔ میں نے اپنے بیٹوں کو بتایا۔ ”تمہیں میرے بارے زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو اگر وہ تمہیں گولی مارنا چاہتے ہیں تو بہادری سے مرجاؤ۔ لیکن بھاگ کر پیٹھ میں گولی مت کھاؤ۔“ اور میں نے دینا سے کہا۔ ”اگر موت کو برداشت کرنا مشکل معلوم ہو تو ہندوستان کی قدیم زمانے کی عورتوں کو یاد کرو کہ وہ کس طرح کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جان دے دیا کرتی تھیں۔“

بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بے شمار ہندو اور سکھ جمع کئے ہوئے تھے۔ دوسرے قبائلی اُن کی نگرانی پر مامور تھے۔ ہمیں اس گروہ میں شامل ہونے کا حکم دیا گیا۔ جلد ہی کئی اور حملہ آور وہاں آ گئے۔ وہ ناقابل

برداشت حد تک خونخوار معلوم ہوتے تھے۔

ان میں سے ایک نے مقامی مسلمانوں کے سامنے مختصر سی تقریر کی ”ان خواتین کو آج رات کے لیے یہاں رکھو۔ گائے کا بچھڑا ذبح کرو اور انہیں اُس کا گوشت کھانے پر مجبور کرو۔“ ہمیں گائے کا گوشت کھلانے کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں مسلمانوں کا عقیدہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ میں اس تصور پر کانپ گئی اور خدا سے رحم کی دعا کی۔ کسی طرح میرا میزبان، میرا منہ بولا بھائی اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ وہ میری حفاظت کے وعدے پر اب بھی قائم ہے۔ میں نے اپنے زیورات جو کچھ میں نے پہنا تھا اُتار کر اُس کے حوالے کر دیا۔ اُس نے کہا۔ ”یہ میرے پاس مقدس امانت کے طور پر رہیں گے۔ جب بھی آپ چاہیں واپس لے سکتی ہیں۔“ دودھ لانے والا جسے میں نے پہلے ہی پہچان لیا تھا بھی میرے پاس آیا اور مجھ سے معافی کا طلبگار ہوا۔ اُس نے کہا کہ وہ حملہ آوروں کے سامنے بالکل بے بس تھا اور اُن کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔





## ضمیر لوٹ آتا ہے

دوسرے روز دونوں قبائلی نوجوان واپس آ گئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم سب کو اسی روز دو میل جانا ہے۔ ہمیں بڑا گوشت کھلا کر مسلمان کرنے کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔ ہر مرد اور عورت کی باقاعدہ تلاشی لی گئی۔ اُن کی کرنسی اور زیورات سب چھین لئے گئے۔ کچھ عورتوں نے کرنسی نوٹ اپنی قمیصوں اور شلواریوں کے ساتھ سے ہوئے تھے اور کچھ نے اپنے زیورات کو اپنے لباس کی سلوٹوں میں چھپا رکھا تھا۔ تلاشی انتہائی ہتک آمیز طریقے سے لی گئی۔ جن عورتوں نے کرنسی نوٹ اپنی قمیصوں میں چھپا رکھے تھے، انہیں قمیض اتارنے پر مجبور کیا گیا۔ اُن کی شرم و حیا کا بھی کوئی خیال نہ رکھا گیا۔

میری باری آئی۔ ایک قبائلی نے آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے کوشش کر کے اپنا ہاتھ چھڑایا اور میرے ہونٹوں پر لاشعوری طور پر رام یعنی ہمارے خدا کا نام آ گیا۔ اس سے وہ بہت ناراض ہوا اور مجھے ایک جھٹکے سے دُور کر دیا۔ ”اس جھوٹے مذہب کو ترک کرنا سیکھو۔ کیا تم یہ کرو گی؟ پہلے مرحلے پر مجھے یہ کچھ سہنا پڑا۔

پھر انہوں نے میرے بچوں کی تلاشی لی۔ جب انہیں کچھ نہیں ملا انہوں نے بچوں کو میرے پاس بھیج دیا۔ میرا منہ بولا بھائی بھی یہ دیکھنے کیلئے وہاں آیا ہوا تھا کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور اُس نے قبائلیوں سے کہا کہ کیا اس ساری آزمائش کے بعد وہ ہمیں اپنے گھر لے جاسکتا ہے۔ وہ میرے جانے پر تو راضی ہو گئے لیکن اس پر اصرار کیا کہ میری بیٹیاں وہیں رہیں گی۔ لیکن میں اس کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ اس لیے میرا بھائی کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے واپس چلا گیا۔ اور جب وہ واپس جانے کے لیے اجازت لینے لگا تو اس کی آنکھوں میں آنسوں تیر رہے تھے۔

تلاشی جاری تھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے ہمارے جسموں پر پورا لباس بھی نہ رہنے دیا۔ اتفاق ایسا تھا کہ میں سارے کپڑے پہن کر ہی نہیں آئی تھی۔ ورنہ مجھے بھی اسی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا۔ حملہ آوروں نے گرم

ہانے جارہے ہیں۔ ہم شخصیت اور ہستی کو اپنی زندگی سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ اگر تم واقعی اسلامی عقیدے کے سچے پیروکار ہو تو تمہیں اس احساس اور تصور سے ہمدردی ہونی چاہیے۔ برائے مہربانی ہمارے ساتھ ایک رعایت کرو۔ کیا ایسا کرو گے؟ ہم سب کو اپنے سردار کے حوالے کر دو۔“

تمام حملہ آور ہندوستانی زبان سمجھتے تھے لیکن اُن کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ میرے ساتھ اتفاق کیے بغیر نہ رہ سکے اور کہا۔ ”اسلام ہمیں لوگوں کو اذیت دینے کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے تو تم ٹھیک ہو۔ لیکن ہم بے بس ہیں۔ ہمارا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے۔“ پھر بھی میرے وعظ نے انہیں تھوڑا سا نرم کر دیا اور اب انہوں نے ہمیں ذرا آہستہ آہستہ چلنے کی اجازت دے دی۔

کچھ وقت کے بعد اُن میں سے ایک نے مجھے کہا۔ ظاہر ہے کہ وہ ابھی تک میری گفتگو کے بارے سوچ رہا تھا کہ میں نے کیا کہہ دیا۔

”ہم کافی دُور سے سفر کر کے لڑنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ ہمارے بھی ماں باپ اور بہنیں ہیں۔“ اس نے شرماتے ہوئے بتایا کہ اس کی دو بہنیں بھی جوان اور غیر شادی شدہ ہیں۔

میں نے سوچا کہ اب وقت ہے کہ میں اس پر اپنا موقف واضح کر دوں۔ ”خیر! ایسی صورت میں تمیں یہ ضرور سمجھنا چاہیے کہ وہ کون سے جذبات ہیں جو خاندانی زندگی کی خوشیوں اور دکھوں کو متحرک کرتے ہیں اور چھیڑتے ہیں۔ ہم سب آپ سے صرف یہ توقع کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ بہتر سلوک ہونا چاہیے۔“ میری اپیل نے اُن کے اندر پائی جانے والی نیکی کی حس کو متاثر کیا۔ اُن کے احساس فخر و غرور نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ شرافت کے معروف تقاضوں کو نظر انداز کریں۔ لیکن اگر کرتے تھے تو وہ بھی حکم کے بندے کے طور پر۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

سریش ہمارے آگے آگے حملہ آوروں کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں کچھ فاصلے سے اُسے دیکھتی رہی کیونکہ لڑکا تھکا ہوا تھا اور پیچھے رہتا جا رہا تھا۔ کچھ لمحات کے بعد قبائلی سریش کو لے کر واپس آئے۔ اب وہ پشیمان اور ضمیر کے زندانی لگ رہے تھے۔ یہ بات اُن میں سے ایک کی گفتگو سے ظاہر ہوئی کہ وہ بہت مخلص تھا۔ ”ہمیں حکم ماننا ہے۔ یہاں اس راز کو خفیہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ ہمیں آپ کو ایک ایسی جگہ لے جانے کا حکم ہے جہاں لوگوں کو اذیت دی جاتی ہے۔ لیکن میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ہم آپ اور آپ کے بچوں کی جو مدد کر سکتے ہیں کریں گے۔“ اچھے سلوک کا یہ وعدہ میرے لئے حیرت سے کم نہیں تھا۔ میں حیران تھی کہ کیا اُن کے دلوں کی

ہانے جارہے ہیں۔ ہم شخصیت اور ہستی کو اپنی زندگی سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ اگر تم واقعی اسلامی عقیدے کے سچے پیروکار ہو تو تمہیں اس احساس اور تصور سے ہمدردی ہونی چاہیے۔ برائے مہربانی ہمارے ساتھ ایک رعایت کرو۔ کیا ایسا کرو گے؟ ہم سب کو اپنے سردار کے حوالے کر دو۔“

تمام حملہ آور ہندوستانی زبان سمجھتے تھے لیکن اُن کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ میرے ساتھ اتفاق کیے بغیر نہ رہ سکے اور کہا۔ ”اسلام ہمیں لوگوں کو اذیت دینے کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے تو تم ٹھیک ہو۔ لیکن ہم بے بس ہیں۔ ہمارا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے۔“ پھر بھی میرے وعظ نے انہیں تھوڑا سا نرم کر دیا اور اب انہوں نے ہمیں ذرا آہستہ آہستہ چلنے کی اجازت دے دی۔

کچھ وقت کے بعد اُن میں سے ایک نے مجھے کہا۔ ظاہر ہے کہ وہ ابھی تک میری گفتگو کے بارے سوچ رہا تھا کہ میں نے کیا کہہ دیا۔

”ہم کافی دُور سے سفر کر کے لڑنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ ہمارے بھی ماں باپ اور بہنیں ہیں۔“ اس نے شرماتے ہوئے بتایا کہ اس کی دو بہنیں بھی جوان اور غیر شادی شدہ ہیں۔

میں نے سوچا کہ اب وقت ہے کہ میں اس پر اپنا موقف واضح کر دوں۔ ”خیر! ایسی صورت میں تمہیں یہ ضرور سمجھنا چاہیے کہ وہ کون سے جذبات ہیں جو خاندانی زندگی کی خوشیوں اور دکھوں کو متحرک کرتے ہیں اور چھیڑتے ہیں۔ ہم سب آپ سے صرف یہ توقع کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ بہتر سلوک ہونا چاہیے۔“ میری اپیل نے اُن کے اندر پائی جانے والی نیکی کی حس کو متاثر کیا۔ اُن کے احساس فخر و غرور نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ شرافت کے معروف تقاضوں کو نظر انداز کریں۔ لیکن اگر کرتے تھے تو وہ بھی حکم کے بندے کے طور پر۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

سریش ہمارے آگے آگے حملہ آوروں کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں کچھ فاصلے سے اُسے دیکھتی رہی کیونکہ لڑکا تھکا ہوا تھا اور پیچھے رہتا جا رہا تھا۔ کچھ لمحات کے بعد قبائلی سریش کو لے کر واپس آئے۔ اب وہ پشیمان اور ضمیر کے زندانی لگ رہے تھے۔ یہ بات اُن میں سے ایک کی گفتگو سے ظاہر ہوئی کہ وہ بہت مخلص تھا۔ ”ہمیں حکم ماننا ہے۔ یہاں اس راز کو خفیہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ ہمیں آپ کو ایک ایسی جگہ لے جانے کا حکم ہے جہاں لوگوں کو اذیت دی جاتی ہے۔ لیکن میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ہم آپ کے بچوں کی جو مدد کر سکتے ہیں کریں گے۔“ اچھے سلوک کا یہ وعدہ میرے لئے حیرت سے کم نہیں تھا۔ میں حیران تھی کہ کیا اُن کے دلوں کی

اس تبدیلی کا باعث سریش تھا یا شاید میں نے جب اُن کے دینکے بارے بات کی تو اُن کے دل و دماغ کا کوئی نرم و نازک گوشہ متاثر ہوا۔ جو بھی ہوا، نیکی کے اس اچانک اظہار نے مجھے فوری طور پر مطمئن کر دیا۔

ہم تقریباً 10 بجے کے قریب دو میل پہنچے۔ جانوروں کا ہسپتال جو دریائے کشن گنگا (نیلیم) کے کنارے واقع تھا اور جہاں سے ہو کر دریا نظر آ رہا تھا، جلنے سے بچ گیا تھا۔ ہسپتال کے کمرے کافی وسیع تھے اور ہمیں اُن میں سے ایک میں ڈال دیا گیا۔ کئی ہندو خواتین اور بچے دو تین دن پہلے سے وہاں جمع تھے۔ کمرہ تاریک بھی تھا اور گنجائش سے زیادہ ہجوم کے سبب تنگ بھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گلا دبایا جا رہا ہو اور تازہ ہوا کی خواہش کے لئے شدت بڑھ رہی ہو۔

جب ہمارا گروہ کمرے کے اندر داخل ہوا تو فی الواقع ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ وہاں پہلے سے موجود بد قماش لوگوں کے ایک بے ڈھنگے سے گروہ نے ہمارا استقبال کیا۔ اُن میں کچھ ڈوگرہ فوج کے بھگوڑے تھے اور کچھ پاکستانی جنہوں نے اپنے آپ کو ”جہادی“ کے طور پر رجسٹر کروایا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں یوں اُچھل کود رہے تھے جیسے گندی ہوا کا جھونکا۔ وہ خواتین کے چہروں پر ٹارچ کی روشنی پھینکتے اور گنواروں کی طرح ہاتھ مل مل کر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ جبکہ یہ وحشی غوغا آرائی ہمارے کان بہرے کیے دے رہی تھی۔ انہوں نے زمین پر اصلی جہنم برپا کر رکھا تھا۔ وہ تیار تھے کہ کئی عورتوں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ خواتین انکار کر رہی تھیں اور ہمیں اُن کے رونے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

لیکن حملہ آوروں پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ان ”جہادیوں“ کے لیے یہ آگ کا ہتسمہ (Batisma) نہیں تھا۔ وہ بہت کچھ جلا چکے تھے اور بے شمار عورتوں کی آبروریزی کر کے گناہ کے راستے پر ڈٹ چکے تھے۔ لیکن وہ دو حملہ آور جنہوں نے ہمیں یہاں لایا تھا بھی ابھی تک اپنے وعدے پر قائم تھے۔ وہ ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے اور دوسرے حملہ آوروں سے ہمیں الگ کر دیا۔ جو یاد دیتاں ہمارے ارد گرد ہو رہی تھیں ہم اُن کو دیکھ کر کانپ رہے تھے لیکن کسی کو بھی ہمارے قریب آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ عین اُسی وقت ایک آفیسر جو یقیناً اُن سے سینئر ہوا ہو گا اندر آیا اور اُس نے بلند آواز سے انہیں حکم دیا کہ وہ عورتوں کو فی الحال اکیلا رہنے دیں۔ حملہ آور اس کا حکم ماننے کی بجائے اپنی عرض کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

جب تمام خواتین اٹھائی جا چکیں تو ہمیں اُن دو حملہ آوروں کے پاس چھوڑ دیا گیا۔ انہوں نے اپنی رائفلیں نکالیں اور حفاظت کے لیے دروازے پر بیٹھ گئے۔ ایک ساتھ والے کمرے سے ہمیں سسکیوں اور چیخوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگ پانی اور کھانے کے لیے چیخ رہے تھے۔ انہیں تین دن سے

بغیر کچھ کھائے پیئے بند رکھا گیا تھا۔ کچھ بے ہوش ہو کر گر چکے تھے اور ان کی حالت بہت خراب تھی۔ ان کی بے بس سسکیاں سننا بے حد دکھ دہ اور اذیت ناک تھا۔ میں زیادہ دیر تک اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ان دو حملہ آوروں سے جنہوں نے تھوڑی دیر پہلے انسانیت کا مذہب قبول کر کے مجھے حیران کر دیا تھا، بات کروں گی۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ دوسرے کمروں میں بند قیدیوں کے لیے کہیں سے پانی لادیں۔ دوسری مرتبہ بھی معجزہ ہی ہو گیا۔ وہ فوراً تیار ہو گئے اور جا کر ایک گھڑا پانی لے آئے۔ ہم دوڑ کر دوسرے کمرے میں گئے۔ یہ بہت تاریک تھا اور کوئی پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ پانی کی سب سے زیادہ ضرورت کس کو ہے۔ لیکن ہر قیدی نے پانی پیا اور جلد ہی گھڑا خالی ہو گیا۔

اُن میں کچھ بے ہوش ہو کر گرے ہوئے تھے اور ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی مر چکے تھے۔ ایسا اندوہناک منظر تھا جسے دیکھ کر کوئی بھی پاگل ہو سکتا تھا۔

ماؤں نے اپنے بچوں کو مار دیا تھا کہ کہیں کوئی اُن کی بے حرمتی نہ کرے۔ ہر طرف رونے اور آہ وزاری کا سماں تھا۔ لوگوں کے لیے اپنی زندگی بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ کچھ نے اپنے مقدّر سے سمجھوتہ کر لیا لیکن کچھ دوسروں نے لڑائی کا فیصلہ کیا۔ کئی زندگیاں تو پہلے ہی ضائع ہو چکی تھیں۔

یہ سب کچھ ان خواتین کے لئے مشکل اور ناممکن آزمائش کی طرح تھا۔ ایک ایسی آزمائش جس میں خوف و دہشت اور نہ ختم ہونے والا انتظار تھا۔ وہ ایک ایسے بے آبروہ انجام کی منتظر تھیں جس میں یقینی لڑائی کا سامنا کرنے کے لیے نہ ختم ہونے والا انتظار بھی برداشت کرنا تھا۔ یہ انتظار ایک روح کش تجربہ تھا اور جب وہ لڑائی قریب آئی تو اس نے ایسی چوٹ لگائی جو ناقابل برداشت تھی کیونکہ اُن کے اعصاب اس کے انتظار میں پہلے ہی دندانہ دار ہو چکے تھے۔ وہ اٹھیں اور انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی جان لے لی کیونکہ وہ اس طرح اپنی موت کا مزید انتظار نہیں کر سکتی تھیں جبکہ اُن کے معدے بالکل خالی تھے۔ اُن سب نے موت کو اس لیے ترجیح دی کہ انہیں اپنی عزت ہر چیز سے پیاری تھی اور وہ آبروریزی کے خطرہ کو برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ وہاں حفاظتی عملہ اتنا نہیں تھا جو ان سب کی نگرانی کر سکے اس لیے انہوں نے بھاگ کر دریائے کشن گنگا (نیلیم) میں چھلانگ لگا دی۔ خود چھلانگ لگانے سے پہلے انہوں نے اپنے چیختے ہوئے بچوں کو دریا میں پھینکا۔ آہستہ اور دھیرے دھیرے بہتے ہوئے دریائے اُن سب کو نگل لیا۔ نہ صرف ان کے جسموں کو بلکہ ان کے مصائب کو بھی۔

قبائلی سرداروں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کچھ ہو رہا ہے تو انہیں یہ بات بہت بُری لگی کہ اتنی ساری خواتین اس قدر آسانی سے اپنی عزت بچا کر بھاگ جائیں۔ انہیں زیادہ اطمینان تب ہوتا کہ یہ خواتین



فوراً مرنے کے بجائے آہستہ آہستہ اذیت کے ذریعہ ماری جائیں۔ اس لیے زیادہ مرد وہاں بھیج دیے گئے۔ سخت حفاظتی نظام قائم کیا گیا۔ مردوں کو عورتوں سے الگ کر کے دُور لے جایا گیا جبکہ ہر ایک کو یقین تھا کہ ان مردوں کو ذبح کرنے کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔ جدائی کے وقت دردناک مناظر دکھائی دیئے۔ بچے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، اور چیخ رہے تھیکہ انہیں والدین سے الگ نہ کیا جائے۔

جب سب چلے گئے تو دونوں نوجوان حملہ آور دوست واپس آئے۔ اُن میں سے ایک نے کمبل نیچے بچھایا اور سویڈش اور وینا کو اس پر لٹا دیا۔ پھر اُس نے دوسرا کمبل لے کر اُن کے اوپر پھینک دیا۔ کئی محافظ (Guards) جو اُسی دن وہاں پہنچے تھے، وہاں سے گزرتے اور بلا ناغہ پوچھتے کہ ان کمبلوں کی بچے کون سویا ہوا ہے۔ جس کا جواب وہ دونوں نوجوان حملہ آور خود یہ کہہ کر دیتے تھے کہ اس کے نیچے سپاہی آرام کر رہے ہیں۔ وہ بغیر کسی وقفے اور ناغے کے نگرانی کر رہے تھے کہ وہاں ایسا ویسا کوئی نہ آجائے۔ انہوں نے کھانے کے لیے بھی وقفہ نہیں کیا کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ شاید ہمیں دریافت کر لیا جائے گا۔

عین اُس لمحے کچھ قبائلی جو تھوڑی دیر پہلے ہمارے گروہ سے کئی خواتین کو اٹھا کر لے گئے تھے واپس آگئے۔ اُن میں کچھ جموں اور میرپور کے مسلمان فوجی بھگوڑے بھی تھے۔ پہلے ہی کی طرح ہاتھ پائی دوبارہ شروع ہو گئی۔ ہر عورت ڈری اور سہمی ہوئی کئی حملہ آوروں میں گھری ہوئی تھی۔ ریاستی فوج کے بھگوڑے اور باغی قبائلیوں سے زیادہ بُرے ثابت ہو رہے تھے۔ کیونکہ وہ زیادہ سنگدل اور ظالم تھے۔ وہ ماؤں کی گود میں بیٹھی نیند سوئے ہوئے بچوں کو زور سے کھینچ کر الگ کرتے اور انہیں زمین پر پٹک کر عورتوں کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے جاتے۔

کچھ حملہ آوروں نے کمرے کے اُس حصے کی طرف دوڑ لگائی جہاں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے دونوں پٹھان دوستوں نے جواب بھی محافظ کے طور پر کھڑے تھے دو چار کی کھوپڑی پر اپنی بندوتوں کے بٹ مارے۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے اور غلیظ گٹھڑی کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ دوسروں نے قریب آنے کی ہمت نہ کی کیونکہ دونوں پٹھان اُن کو ڈرا کر واپس کر دیتے تھے۔ ”ادھر آنے کی جرأت نہ کرنا اگر آپ نے ایسا کیا تو ہم تمہاری کھوپڑیاں توڑ دیں گے۔“ انہوں نے دھمکی دی۔

میں سوچ کر حیران ہوتی تھی کہ یہ بیچارے ان وحشی درندوں کو کب تک روک سکیں گے۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اگر یہ پھسل کر ٹوٹ گئے تو مجھے بھی اپنے بچوں سمیت دریا میں چھلانگ لگانی ہوگی۔ حالانکہ ایسی موت کا خیال بھی بدمزہ اور بددل کر دیتا تھا۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ ہر طرف دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ دونوں پٹھانوں میں سے ایک میرے

پاس یہ تجویز لے کر آیا۔ ”ہم اپنے دو دوستوں کو آپ کا خیال رکھنے کے لیے چھوڑ کر جائیں گے۔ میں ان لڑکیوں کو زیادہ دیر تک آپ کے پاس محفوظ نہیں سمجھتا۔ اس لیے میں مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ہم پر بھروسہ کریں اور انہیں یہاں سے کہیں اور لے جانے دیں۔ اب تک ہم نے واقعی بڑی مشکل سے انہیں بچایا ہے لیکن اگر کسی طرح صبح تک کسی اور کو ان کا پتا چل گیا تو یہ انکشاف بے حد خطرناک اور خوفناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جوں ہی ہمیں ان کی حفاظت کا یقین ہو گیا تو ہم انہیں واپس لے کر آجائیں گے۔ آپ کو بالکل پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے فوراً اس تجویز سے اتفاق کر لیا اور وہ سویدش اور وینا کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دو نئے نگران جو اُن کی جگہ آئے درحقیقت سادہ ذہن کے پٹھان تھے اور انہوں نے میرے بچوں کو ٹوکری بھر کر سب، الغوزے اور خوبانیاں دیں۔ بچوں کے چہرے پھل دیکھ کر چمک اُٹھے۔ وہ کئی دن سے بھوکے تھے۔

میں نے اپنے نئے نگرانوں سے پوچھا۔ ”کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہاں کے ضلعی آفیسروں کے ساتھ کیا ہوا؟“ میں نے اندازہ کیا کہ وہ اس سلسلہ میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اس لیے میں نے اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ ”میرے شوہر بھی اُنہی میں تھے۔ وہ یہاں وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) تھے۔“

اُن میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن میں سے آپ کا شوہر کون سا تھا لیکن ہمیں حکم تھا کہ ہم اُن سب کو قتل کر دیں۔“ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں اس خیال کا سامنا نہ کر سکی کہ میرے شوہر بھی ان آفیسروں میں شامل ہوں گے جنہیں ان حملہ آوروں نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

حملہ آوروں کے بارے سوچتے ہوئے میرا ذہن منتشر تھا اور مجھے اُس وقت ان چار پٹھانوں کا خیال آیا کہ یہ دوسروں سے کتنے مختلف ہیں اور وہ مجھ پر کتنے مہربان رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ دوسرے بھی پیدائشی طور پر اتنے ہی اچھے ہوں گے اور میں نے چیخ کر کہا۔ ”تم فرشتے ہو جنہیں خدا نے میری مدد کے لیے بھیجا ہے۔“ ان الفاظ نے اُن میں بھی اسی قسم کا رجحان (موڈ) ابھارا اور انہوں نے کلمہ کا ورد شروع کر دیا۔ انہوں نے خواہش کا اظہار کیا کہ میں بھی اُن کے ساتھ کلمہ پڑھوں۔ میں نے سوچا کہ ان کی خواہش کا احترام مناسب ہوگا اس لیے مجھے اپنے ساتھیوں کی اس چھوٹی سی خود نمائی کو سہلانے میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔ جب انہوں نے کلمہ پڑھا تو میں نے بھی لفظ بہ لفظ اُن کی پیروی کی۔

اتنے میں حملہ آوروں کا ایک اور گروہ آگیا۔ دوسرے کمرے سے دوبارہ دردناک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اُن میں سے دو نے ہمارے کمرے میں گھسنے کی کوشش کی لیکن میرے دو ساتھیوں نے اُنہیں ڈرا دھمکا کر واپس کر دیا جس کی وجہ سے میں ان دونوں کی نیک نیتی کی بھی قائل ہو گئی۔ جوں ہی کچھ وقت گزرا

ایک پٹھان نے مجھے مشورہ دیا۔ ”کیا آپ ہمارے ساتھ ہمارے ملک چلنا پسند کریں گی؟ ہم آپ کے رہنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کر لیں گے۔ ہو سکتا ہے یہ جگہ مسجد کے اندر ہو۔ اور اگر آپ چائیں تو وہاں آباد ہونے میں آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔“ مجھے انتہائی نرمی سے دینتبدیل کرنے کی دعوت دی گئی۔ میں اس فکر مندی کے لیے فراوانہجہ تک اُن کی شکر گزار تھی لیکن میں نے وضاحت کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ میں شوہر اور بچوں کو پیچھے چھوڑ کر اپنے ملک سے کہیں دور نہیں جاسکتی۔ اس کے علاوہ میں نے انہیں یہ بھی یاد دلایا کہ میں ابھی اتنی بوڑھی نہیں ہوئی کہ میں کسی قسم کی خانقاہ کا سہارا لوں۔

ہم ابھی یہ گفتگو کر رہے تھے کہ دوسرے کمرے سے مجھے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے خواتین کو چیختے ہوئے سنا کہ وہ اپنی بے عزتی اور آبروریزی کی بجائے موت کو ترجیح دیں گی۔ اس کے باوجود انہیں ایسے ہوس پرست، شیطان صفت اور وحشی مردوں کی ہوس مٹانے کے لیے جن جیسوں کے منہ پر کبھی انہوں نے تھوکا تک نہیں تھا، گھسیٹ کر لے جایا گیا۔



## اجتماعی خودکشی

آج کا طلوع آفتاب ہماری مایوسیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ میری بیٹیاں تو شاید اپنے محافظوں کے ساتھ اب تک کسی محفوظ جگہ پہنچ چکی ہوں گی۔ دوسری خواتین میرے اس روئے پر حیران تھیں کیونکہ اُن کے نزدیک یہ حماقت کی انتہا تھی کہ میں نے اپنی بیٹیاں دوائے ناواقف حملہ آوروں کے ساتھ بھیج دی ہیں جو امکانی طور پر کسی بھی وقت دغا باز ثابت ہو سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ دوائے آدمی تھے جن کے پاس پہلے بھی اپنا ارادہ بدل لینے کے لیے کافی وقت تھا اور اگر وہ چاہتے تو گزشتہ شب کچھ بھی کر سکتے تھے انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ آخر کار اُس بات کی بھی تو کوئی اہمیت ہے کہ انہوں نے اپنے وعدے پر قائم رہنے کے لیے اپنی زندگیوں کو بھی خطرے میں ڈالے رکھا۔ اس لیے میں نے محسوس کیا کہ مجھے بہر حال اُن پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ مزید برآں مجھے دو خطرات میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا: کچھ بھی ہوا اگر لڑکیاں یہیں رہیں تو انہیں جلد یا بدیر اس بے عزتی اور آبروریزی کا سامنا کرنا ہی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ لڑکیوں کو ان دو آدمیوں کے حوالہ کرنے میں پہلے کے مقابلے میں کم خطرہ تھا۔ اور پھر کیا میری بیٹیوں کو یہ علم نہیں تھا کہ اگر ایسا کوئی واقعہ درپیش ہو تو انہیں کیا کرنا ہے؟

تھوڑی دیر بعد ہمیں کچھ وقت کے لیے باہر جانے کو کہا گیا۔ حملہ آور ہمیں لے کر کمرے سے باہر آئے اور دریا کے کنارے چلتے چلتے دو میل کے پُل تک پہنچ گئے۔ جو کچھ میں نے وہاں دیکھا وہ میں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ اس سے قبل میں یہ تو سنتی رہی تھی کہ کتنی ہی عورتوں نے دریا میں چھلانگ لگائی لیکن یہ المناک منظر میں پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی جس میں انسانیت رضا کارانہ طور پر زندگی کی نعمت سے دستبردار ہو رہی تھی اور وہ بھی کسی بڑے مقصد کے بغیر۔ کچھ خواتین جن کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ابھی دریا کے کنارے کھڑی تھیں اور کچھ پہلے ہی گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے بچوں کو دریا کی تیز

لہروں کے حوالے کیا اور اُن کی چیخ و پکار کی قطعاً کوئی پرواہ نہ کی۔ زندگی نیستی کی ضد ہے اور مفقود ہونے سے انکار کرتی ہے۔ بچے جب دریا میں ڈوب کر ابھرتے تھے تو اُن کے ننھے سر ایک دوسرے نظر آتے تھے اور پھر ہمیشہ کے لیے ڈوب جانے سے پہلے اُن کے چہروں پر درد و کرب اور اذیت دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ مائیں یہ سب کچھ خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی تھیں۔ کئی دنوں کی اذیت نے اُن کے چہروں کے رنگ اور ہر قسم کے جذبات کو دھو ڈالا تھا۔ اس کے بعد وہ خود دریا میں کود جاتیں اور سارا کھیل پلک جھپکنے میں ختم ہو جاتا تھا۔

اسی اثنا میں دریا کے کنارے پر کھڑے بچے یہ جان لیتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے اور اس یقینی جبلت، جو انسان اور جانور میں مشترک ہے، کے ذریعے انہیں موت کا رنگ و بوی واضح طور پر محسوس ہونے اور دکھائی دینے لگتے تھے۔ وہ دوڑ کر اپنی ماؤں کے پاس جاتے تھے اور اُن کے ایک طرف کھڑے ہو کر مایوسی کے نتیجے میں ودیعت ہونے والی طاقت کے بل بوتے پر کبھی بھی جُدا نہ ہونے کے لیے اُن کے گھٹنوں سے لپٹ جاتے تھے۔ حملہ آور لاکھ کوشش کرتے تھے کہ ان عورتوں کو اس طرح مرنے نہ دیا جائے۔ وہ دھمکیاں دیتے تھے اور ڈنڈے برساتے تھے۔ بلکہ وہ بندوقیں تان کر اُن خواتین پر گولی بھی چلاتے تھے، جو ذرا دُور ہوتی تھیں۔ لیکن خود کشی کی خواہش میں اس قدر شدت تھی کہ وہ کسی کے درد، رحم یا احساس کا اظہار کیے بغیر موت کی آغوش میں چلی جاتی تھیں۔

اگرچہ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ اُس روز کتنی خواتین اور کتنے بچوں نے اپنی زندگی دریا برد کی ہوگی۔ تاہم میرے علاوہ تین اور خواتین جو میرے ہی کمرے میں تھیں، نے اپنے آپ کو مرنے نہیں دیا۔ میں نے اپنے بارہ سالہ بچے ویمل کو دریا کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اس لیے میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر روک دیا۔

”ماں“ اُس نے کہا ”مجھے جانے دو۔ کیا مجھے جانے دوگی؟ میں مرنا چاہتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ میری بہنوں کے ساتھ کیا بیت رہی ہوگی، مزید برداشت نہیں کر سکتا۔“

اُس نے اپنے آپ کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن میں نے اُسے پیچھے کھینچ لیا۔ ”آپ بزدل ہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ ایک شرمناک موت مرنا چاہتی ہیں اور آپ اس صورتِ حال سے باہر نکلنے کے لیے اپنی چھوٹی انگلی اُپر اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ آپ کو موت کا خوف نہیں ہونا چاہیے..... ماں! آپ کو مرنے کے لیے کوئی قابلِ قدر کام کرنا چاہیے۔“

وہ کسی قسم کی کوئی دلیل یا حجت سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب خود کشی کو حل سمجھ لیا جائے تو یہ سب کو



مفید نظر آنے لگتا ہے۔ میرے بیٹے نے بھی اس فضول حل کی فراری رُوح سے (Escapism) شناسائی حاصل کر رکھی تھی۔ ”اب کوئی غیرت مند عورت زندہ نہیں ہے۔۔ ماں! آپ بھی میری بہنوں کو لے کر دریا میں کود کیوں نہیں جاتیں؟ مجھے اپنی تقدیر کے حوالے کر دیں۔ میں خود اپنے آپ کو قتل کر دوں گا۔“

میں نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میرے بیٹے! اتنے ضدی نہ بنو۔ کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ اگر میں چاہتی تو دریا میں کود سکتی تھی۔ کیا تم اپنے باپ کو بھول گئے ہو؟ جب تمہارے پاپا یہ سنیں گے تو اُن کا بُرا حال ہو جائے گا۔ مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہے کہ اُن کے ساتھ کیا ہوتی۔ اس کے بعد میں سوچ سکتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“

ایک حملہ آور ہمارے قریب سے گزر رہا تھا وہ مجھ پر آوازہ کسنے کے لیے رُکا اور بولا ”تم بھی کود کیوں نہیں جاتی؟ میں تمہیں ہر گز نہیں رُکوں گا۔ تمہیں اس کا یقین ہونا چاہیے؟“

”ٹھیک ہے لیکن بد قسمتی سے فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نے اعتماد سے جواب دیا۔ لیکن کئی حملہ آور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اُس منظر نے جوانہوں نے ابھی ابھی دیکھا تھا انہیں بُری طرح متاثر کر دیا تھا۔ میں یہ جان کر حیران ہوئی کہ میں نے یہ کیوں سوچا تھا کہ یہ سب میرے نجات دہندہ چار پٹھانوں سے مختلف ہیں۔ شاید پیدائشی طور پر وہ سب اچھے تھے۔ اُن کی نرم دلی کے اظہار سے حوصلہ پا کر میں نے انہیں بتانے کی جرأت کی ”اب آپ کیوں رو رہے ہیں۔ اب پچھتانے یا افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ نے اپنے ہاتھوں کو بے گناہوں کے لہو سے رنگ دیا ہے۔ آپ کی یادوں میں یہ منظر ہمیشہ آپ کا پیچھا کرتا رہے گا۔ آپ کے اندر کبھی بھی ایسی مصفا سوچ پیدا نہیں ہو سکے گی جو اس غلیظ یاد سے آلودہ نہ ہو۔“

دوسری عورتوں کا خیال تھا کہ شاید میں نے زیادہ دلیرانہ گفتگو کر لی ہے۔ انہوں نے مجھے سرگوشیوں کے ذریعے روکنے کی کوشش کی۔ ”اب تم چپ کر جاؤ۔ تم غیر ضروری اور بے ترتیب باتیں کر رہی ہو۔ اس سے تو ہم پر کوئی نئی مصیبت نازل ہو سکتی ہے۔“

میں نہیں جانتی کہ کتنے حملہ آوروں نے میری ہندوستانی سمجھی ہوگی لیکن اُن میں سے ایک نے تو متاثر ہو کر کھلم کھلا اقبال جرم کیا۔ ”آپ نے جو کچھ کہا ٹھیک کہا۔ مہربانی کر کے بتاؤ کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

وہ صاحب اختیار معلوم ہوتا تھا۔ وہ واقعی مفید عادت ہو سکتا تھا اور میں حیران تھی کہ کیا وہ میری بیٹیوں کی بازیافت میں میری کچھ مدد کر سکتا ہے۔ تاہم قبل اس کے کہ میں کوئی تجویز پیش کرتی۔ اُس نے کہا۔ ”یہ ایک

آدمی ہے جو آپ کو حفاظت سے جیل میں لے جا کر چھوڑے گا۔“ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے بچوں کو ہمراہ لے کر شہر کی طرف چل پڑی۔ جیل ایک چھوٹی سی پہاڑی کے نیچے واقع تھی۔ راستے میں ہم نے کئی گھر دیکھے جو مکمل جل چکے تھے اُن کی تھلسی ہوئی باقیات نیلے آسمان کے سامنے بھڑی اور غلیظ قطاریں بن کر کھڑی نظر آرہی تھیں۔ اس کے باوجود ایک یا دو سپاہی ادھر ادھر مٹر گشت کر رہے تھے۔ وہ لوگوں کو راستے میں روک کر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے پر مجبور کرتے تھے۔

ہمارا گائیڈ بمشکل بائیس سال کا ہوا ہوگا جس سے میں نے راستے میں بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ اپنا گھربار چھوڑ کر اتنی دُور کیوں آئے ہیں؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے فوراً جواب دیا۔ ”کیونکہ پاکستان کے حکمرانوں نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے اور کشمیر کے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور مسلمان عورتوں کی عزتیں خطرے میں ہیں۔“

میں نے اُسے بتایا کہ یہ بالکل غلط اور جھوٹ پر مبنی پروپیگنڈہ ہے کیونکہ اس حملے سے پہلے ریاست میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ لیکن وہ جھوٹ جو کافی عرصہ سے اُس کے ذہن کو گہرائی تک متاثر کر چکا تھا، کی وجہ سے وہ اپنے موقف پر قائم رہا اور قائل نہ ہو سکا۔ ”قبائلی دھمکیاں برداشت نہیں کر سکتے اور وہ کشمیر میں مسلم خواتین کی حفاظت کے لئے آئے ہیں۔ وہ اپنی بات پر قائم تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اس گمراہ نوجوان کو کیسے قائل کر سکتی ہوں کہ کشمیر میں اگر کسی کو حفاظت کی ضرورت ہے تو وہ مسلمان خواتین نہیں۔“

میں نے محض تجسس کے باعث اُس سے پوچھ لیا کہ ”کیا تمہیں اس کا معاوضہ دیا جاتا ہے؟“ وہ نہیں، اُس نے کہا۔ ”ابھی تک اس بارے کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ ہمیں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ہم ہندوؤں کو قتل کریں، اپنی پسند کی لڑکیوں کو اٹھا کر لے جائیں، کوئی بھی چیز جو ہمیں ملتی ہے اُسے لوٹ لیں اور گھروں کو جلا کر خاکستر کر دیں۔ کیونکہ درحقیقت جو چیز ہمیں چاہیے وہ تو زمین ہے۔“

”تم لوگوں نے جو کچھ یہاں کیا ہے۔ یہ تمہارے اور تمہاری نسل کے لیے نیک نامی کا باعث نہیں

بنے گا۔ تم نے اپنے مذہب کے ہر حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔“

اُس نے جواب دینے سے گریز کیا۔ ”آپ جانتی ہیں کہ یہ سچ ہے کہ بہت سے قبائلی یہاں صرف لوٹ مار کے لیے ہی آئے ہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ کشمیر سے بڑی مقدار میں سونا ملے گا۔ ہم نے اُن سب کو قتل کر دیا ہے۔ صرف وہی چند لوگ زندہ ہوں گے جو پہلے روز سے ہی چھپے ہوئے ہیں۔ خواتین جو زندہ ہیں وہ یا تو بوڑھی ہیں یا زخمی۔ البتہ کچھ نوجوان عورتیں ابھی جیل میں ہیں۔“

میں نے سوچا کہ یہ تجزیہ دل شکن تو ہے، لیکن ہے درست۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ راستے میں ہمیں مقامی مسلمانوں کے گروہ ملے اُن میں سے کچھ کو ہماری حالت پر افسوس تھا۔ کچھ کا خیال تھا کہ ہمارے ساتھ ٹھیک ہوا ہے۔ ہم کچھ قبائلیوں سے بھی ملے جو ننگے پاؤں تھے اور اُن کا لباس بھی تار تار تھا۔ انہوں نے اپنی بندوقیں کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں۔ اور اُن کی گولیاں مخصوص ڈبوں میں اُن کی کمر کے گرد بندھی ہوئی تھیں۔ وہ محض آوارہ گردی کر رہے تھے اور جب وہ ہنستے تھے تو اُن کی خوشی سے عاری ہنسی بہت شور پیدا کرتی تھی۔ اُن میں سے کچھ لوٹ مار کے سامان کی تقسیم پر لڑ جھگڑ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک نے ہمیں اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ میرے بیٹے مل اور بیٹی مکلیش کی طرف انگلی اٹھا کر چیخا ”یہ کتنے خوب صورت بچے ہیں ہم انہیں اپنے ساتھ لیے چلتے ہیں۔“

ہمارے نگران نے اُن سے ایسی زبان میں بات کی جو میں سمجھ نہ سکی لیکن اُس آدمی نے فوراً اپنا ذہن بدل لیا اور اعلان کر دیا کہ ”ہم انہیں جیل سے بھی پکڑ لیں گے۔ جیسے جیسے ہم چلتے جاتے تھے تو وہ بچوں کو اپنی ملکیت کے طور پر دیکھ رہے تھے۔“

ہم بالآخر ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں سے ہم اپنے بنگلے کی دیوار دیکھ سکتے تھے۔ اگرچہ وہ جل چکا تھا لیکن اب بھی جانا پہچانا سا لگتا تھا۔ میں محسوس کرنے لگی کہ گھر بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے اور جو کچھ گزشتہ چند روز سے ہم پر گزر رہا ہے وہ کسی ڈراؤنے خواب کا حصہ ہے۔ ہنوشی کا ایک عارضی لمحہ تھا جب میں نے چیخ کر کہا ”وہ ہمارا گھر ہے۔“

”ایسا ہے؟ لیکن اب تو ہمارے لوگ اُس میں رہ رہے ہیں“ میرے نگران نے مجھے مطلع کیا۔ میں وہاں ذرا سا ٹھہر کر گھر کی باقیات دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن ہمیں آگے دھکیل دیا گیا۔

جیل مردوں، عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی تھی۔ اُن میں سے کچھ کے ہاتھوں اور ٹانگوں پر گولیاں لگی ہوئی تھیں اور وہ درد سے کراہ رہے تھے۔ بچوں کو چار دن سے کھانے پینے کے لیے کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ کوئی اپنے بچے کے لیے رو رہا تھا اور کوئی اپنی بیوی کے لیے کسی سے اس کی بیٹی چھین لی گئی تھی اور کسی سے اُس کی بیوی۔ بہت سی نوجوان عورتوں نے حملہ آوروں کی ہوسناک نگاہوں سے بچنے کے لیے اپنے چہروں پر گوبر، مٹی اور گارامل کر اپنی شکلیں بگاڑ رکھی تھیں۔ میری نظر شیوا دیال اور اوم پرکاش پر پڑی۔ انہیں بے حد خوشگوار حیرت ہوئی اور مجھے بھی۔



## اکلوتا شہید

ہم ایک ٹوٹی ہوئی چار پائی پر بیٹھ گئے۔ اب وہ لمحہ جس کا مجھے کافی دیر سے انتظار تھا، آن پہنچا تھا۔ میں صبر و قرار کھورہی تھی اور میری سانس رکی ہوئی تھی۔ میں نے شیوا دیال اور اوم پرکاش سے مہتا جی کے بارے جاننا چاہا۔ جیل کا سابق داروغہ بھی اُن کے ساتھ ہی تھا۔ اس طرزِ مخاطب میں بد خبری اور نحوست کا ملا جلا تاثر تھا۔ تاہم وہ قدرے ایک لمبی کہانی سنانے کے لیے تیار دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے کہا ”ماتا جی! مجھ میں نہ تو ہمت ہے اور نہ ہی صلاحیت کہ میں اُس سارے حادثے کو من و عن از سر نو اپنے ذہن میں جگہ دے سکوں۔ یہ واقعہ پہلے ہی روز کا ہے۔ میں جانتا تھا کہ کیا ہوا ہے لیکن میں وہ سب کچھ آپ کو نہیں بتا سکتا تھا کہ..... مہتا صاحب.....“

میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہ کہانی یہیں پر ختم کر دے۔ مجھے جبلی طور پر معلوم تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ کوئی ایسی بات کہنے جا رہا ہے جسے میں گزشتہ کئی دنوں سے جان بوجھ کر ماننے سے انکار کرتی رہی تھی۔ مہتا جی شہید ہو چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل کر دور جا چکی تھی اور اب میرے لئے اندوہناک غم و دل گرفتگی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں ایک ایسی دُنیا میں تنہا ہو کر خیالات میں ڈوب گئی جہاں ذات اور بیرون ذات ایک ہو جاتے ہیں۔ مجھے شرم بھی آنے لگی تھی اور درد بھی محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اُس مقصد کے لیے جدوجہد میں حصہ لینے سے انکار کیا جس کی خاطر انہوں نے جان دی۔ یہ ایسا مقصد تھا جس میں اُن کی موت کے لیے کافی جواز موجود تھا۔ یہ خود غرضانہ سوچ تھی کہ میں اس عظیم سانحہ کے موقع پر اُن کے شانہ بشانہ موجود نہ تھی۔ اگر میں بھی اُن کے ساتھ مرجاتی تو میری موت بھی ہمیشہ کے لیے اہمیت اختیار کر لیتی۔ یہ سوچ کر میرا درد لوٹ آیا لیکن اس کے ساتھ یہ ٹھوس حقیقت بھی کہ وہ دوبارہ کبھی بھی میری خوشی اور غمی میں حصہ نہیں لے سکیں گے اور بقیہ زندگی میں مجھے ہمیشہ اُن کی یاد ستاتی رہے گی..... ہر وقت اور ہمیشہ.....

میرا جسم درد کے مارے بالکل مختصر سا ہو کر رہ گیا اور شدت درد نے میرے اعضاء کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں خود چل کر ایک بے مقصد موت کے کنارے پر پہنچ گئی ہوں، جو بالکل بے معنی ہے اور جس کی میں نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔

لیکن کسی نہ کسی طرح میں نے اپنی طاقت مجتمع کی تاکہ میں اُس سے اس واقعہ کی تفصیل معلوم کر سکوں۔ اور اب مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں نے یہ کیسے کر لیا۔

اُس نے جواب دیتے ہوئے کہا ”جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں ادھر ہی تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر آپ کو نہیں بتایا کیونکہ میں جانتا تھا کہ آپ یہ برداشت نہیں کر سکیں گی۔ میرا خیال تھا کہ آپ یہ سن کر کوئی جذباتی قدم اٹھالیں گی اور پھر بچے مکمل طور پر یتیم ہو جائیں گے۔ اگر میں نے یہ خبر اُس وقت آپ تک پہنچادی ہوتی تو آپ یہ چھوٹے چھوٹے کام جو اس وقت کر رہی ہیں، نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے بچوں کی دیکھ بھال کی غرض سے کسی بھی طرح وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔“

میں اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکی اور آہیں بھرنے اور سسکیاں لینے پر مجبور ہو گئی..... ”اوم! تم نے یہ بات مجھ سے پوشیدہ کیوں رکھی؟ انہوں نے اپنی زندگی اپنے وطن پر نچھاور کی ہے اور میں نے کیا کیا.....؟ میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ انہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔ اگر تم نے مجھے یہ سب کچھ پہلے بتا دیا ہوتا تو میں بچوں کو لے کر بنگلے پر چلی جاتی اور ہم سب آخر دم تک اکٹھے رہتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میں زیادہ مطمئن ہوتی۔“

اوم نے سوچا کہ میں یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکوں گی اس لیے وہ میرے بارے زیادہ فکر مند ہو گیا۔ اب داروغہ نے وہ کہانی وہیں سے شروع کی ”ہر شخص وزیر صاحب کی شہادت سے متعلق احترام کے ساتھ بات کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وزیر صاحب نے انتہائی دلیری سے، اپنا فرض ادا کرتے ہوئے جان دی ہے۔ اوم اس بات کی تصدیق کرے گا۔“

اُس کا خیال تھا کہ اس بات سے کہ میرے شوہر کو لوگ احترام سے یاد کر رہے ہیں، میرا غم غلط ہو جائے گا۔ اس لیے اُس نے تفصیل سے ساری کہانی بیان کی۔ ”وزیر صاحب اپنے بنگلے سے نکل کر حائی سکول چلے گئے۔ ان کے ہمراہ سپرینٹنڈنٹ پولیس، سب انسپکٹر اور پولیس کے سپاہی تیس (23) تھے۔ چند روز پہلے سکول کے صحن میں ایک توپ نصب کی گئی تھی اور اُس پر نو سپاہیوں کی ڈیوٹی تھی تاکہ حملہ آوروں کو بھگایا جا سکے۔ لیکن سپاہی بھاگ گئے تھے۔ ہر آدمی نے مہتا جی کو متنبہ کیا کہ وہ سکول کے صحن میں نہ جائیں۔ لیکن انہوں



نے کسی کی نہ مانی۔ وہ اندر گئے اور یہ دیکھ کر غصے میں آ گئے کہ اس جگہ کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ خود سپاہیوں کی مدد سے اُس جگہ کی حفاظت کے لیے تیار ہو گئے۔ کچھ مقامی مسلمانوں نے بھی انہیں روکنے کی کوشش کی۔ ”ہم سب آپ کا احترام کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ آپ اس طرح اپنی زندگی ضائع کریں۔ آپ تنہا سب کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں ہزاروں کی تعداد میں پاکستانی آئے ہوئے ہیں۔“ لیکن اس سے اُلٹا مہتاجی ناراض ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔ ”دیکھو۔ آپ کا ملک خطرے میں ہے۔ آپ کو اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس آپ مجھے بھی جا کر چھپ جانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ آئیے اور آکر میری مدد کیجئے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سکول کی حفاظت کے لیے سپاہیوں کی مدد کریں۔“ لیکن اُن کی مدد کے لیے کوئی بھی سامنے نہیں آیا۔ بلکہ وہ سارے ایک ایک کر کے خاموشی سے نکل گئے۔ سپاہی اور ایک دوسرے لوگ جنہوں نے مدد کی پیشکش کی بہت کم تھے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے مہتاجی نے مایوس ہو کر پھر اُن پر بھروسہ کرنا بھی چھوڑ دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”میں نے کسی قسم کا دفاع بنانے کی پوری کوشش کی لیکن آپ میں سے کوئی بھی اپنی سماجی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتا۔ آپ اپنی زندگی کے علاوہ کسی بارے سوچتے تک نہیں۔ اگر آپ یہاں فرائض ادا کرنے میں میری مدد نہیں کریں گے تو میں گھر چلا جاؤں گا۔ میرا یہ فرض بھی ہے کہ میں اس مصیبت میں اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کروں۔“

لوگوں نے پھر انہیں متنبہ کیا کہ وہ نہ جائیں کیونکہ حملہ آور اُن کے گھر میں داخل ہو چکے ہیں اور اُس پر اُن کا قبضہ ہے۔ مہتاجی نے اُن کی تنبیہ کو نظر انداز کر دیا اور فوراً اپنے بنگلے پر پہنچ گئے۔ پولیس کا سب انسپکٹر جو اُن کے ہمراہ تھا وہ ایک راجپوت تھا لیکن اُن کے ساتھ اندر نہیں گیا بلکہ باہر دروازے ہی پر کھڑا رہا۔ مہتاجی سیدھے گھر کے اندر چلے گئے۔ اس کے بعد کی بات اُوم کو بتانی چاہیے کیونکہ باقی کہانی وہی زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اُوم چیخ رہا تھا اور اُس کی آواز میں گھٹن اور لڑکھڑاہٹ تھی۔ ”میں غسل خانے میں چھپا ہوا تھا جب مہتا صاحب اندر داخل ہوئے۔ میں انہیں غسل خانے کی کھڑکی کے شیشوں سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر پوچھا ”ماتا جی کہاں ہے؟“ میں پاگلوں کے انداز میں اشاروں سے درگاہ کی طرف اشارے کر رہا تھا۔ باہر کھڑا سب انسپکٹر میرے اشاروں کا مفہوم سمجھ گیا لیکن اُس نے اندر آنے کے لیے کوئی کوشش نہ کی۔ مہتاجی مایوس ہو گئے اور ناراض بھی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ”وہ اس طرح کیوں بھاگ گئی؟ اُسے یہیں رک کر صورتِ حال کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ میں اس اُمید پر واپس آیا تھا کہ ہم سب اکٹھے ہو کر بہادروں کی موت مریں گے۔“ تاہم میں نے آپ کے حق میں کچھ کہنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ میں نے صرف اُن کی منت سماجت کی کہ وہ

یہاں سے چلے جائیں۔ تقریباً ساٹھ حملہ آور اُس وقت گھر میں موجود تھے۔ میں نے انہیں متنبہ کیا لیکن انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کریں گے اور کسی بھی صورت پیچھے نہیں ہٹیں گے۔“

اُم اپنی بات مزید جاری نہ رکھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”اُم! مت رو۔ وہ جانتے تھے کہ بہادری سے جان کا نذرانہ پیش کیے جانے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں بزدل تھی کہ وہاں سے بھاگ نکلی۔ بمبربانی اپنی بات جاری رکھو اور مجھے ساری کہانی سناؤ۔“

اُم نے ہمت باندھی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ”قبائلیوں کو پتا چل گیا تھا کہ مہتاجی گھر واپس آگئے ہیں۔ اُن سب نے اپنی رائفلیں اُن پر تان لیں اور چلا کر کہا۔ ”کافر! تم گھٹنوں کے بل جھک کر ہمیں سجدہ کرو، ہم پاکستان کے نمائندے ہیں۔ یہ ہیٹ (Hat) اتار لو۔“ مہتاجی نے کوئی بات نہیں کی اور خاموش کھڑے رہے۔ ”ہمیں بتاؤ کہ تم ہندو ہو یا مسلمان!“ انہوں نے پوچھا۔ مہتاجی نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اسی اثناء میں ایک مقامی مسلمان بھی وہاں آگیا اور اُس نے مہتاجی کی منت سماجت کی کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کریں، آپ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھول کر اپنی زندگی کیسے گنوا سکتے ہیں؟ اور پھر آپ کو ایسا ظاہر کرنے میں کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔“

قبائلی بے قرار ہوئے جا رہے تھے۔ ”ہم ایک مرتبہ پھر پوچھتے ہیں، تم ہندو ہو یا مسلمان؟“ اس مرتبہ وزیر صاحب نے جواب دیا اور زور دیتے ہوئے کہا ”میں ہندو ہوں، مسلمان نہیں ہوں۔“ اس جواب نے حملہ آوروں کو انتہائی مشتعل کر دیا۔ اُن سب نے یکے بعد دیگرے اُن پر فائر کیے۔ وہ اُس وقت تک سیدھے کھڑے رہے جب تک انہیں چار گولیاں لگتیں۔ پھر وہ گر گئے۔ اُس وقت تک اپنی کمزور آواز میں ”رام رام“ کا ورد کرتے رہے جب تک اُن کے جسم سے رُوح پرواز نہ کر گئی۔ میں آخر تک وہیں رہا اور اُس کے بعد بھاگ کر آپ کی طرف آگیا۔ اگرچہ وزیر صاحب نے انتہائی بہادری کا ثبوت دیا لیکن یہ سارا منظر انتہائی الم ناک تھا۔ میں اب تک اس صدمے سے جانبر نہیں ہو سکا۔“

میں نے شیوا دیال سے پوچھا ”میت کے ساتھ کیا ہوا؟“ اس نے کہا ”میرے دوست رام چرت کو وزیر صاحب کی میت اُس راستے پر پڑی ہوئی نظر آئی جو آپ کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ عین اُسی وقت ایک مسلمان ہمسایہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ وہ دونوں مل کر میت کو آپ کے بیڈروم میں لے گئے۔ ان کے جوتے اتارے۔ جب بنگلے کو آگ لگائی گئی تو میت اُس وقت وہیں تھیں، اس لیے وہ جل گئی ہوگی۔ جب قبائلی مہتاجی کو

قتل کر کے واپس لوٹے تو ایک مقامی مسلمان اُن کو ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے سُن رہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے ”یہ شخص جسے ابھی ابھی ہم نے گولی ماری ہے، بے حد دلیر آدمی تھا۔ ہم اس واقعہ کو کافی عرصہ تک بھول نہ سکیں گے۔ دراصل اس کے بارے حکم تو یہ تھا کہ اسے زندہ گرفتار کریں لیکن یہ اتنا ضدی تھا کہ ہم نے غصے میں آکر اسے گولی ماری۔“ میں نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا انہیں یقین تھا کہ وہ وزیر (ڈپٹی کمشنر) تھا؟“

”بالکل۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ وزیر تھا اور یہ گھر بھی اُس کا تھا۔ وہ صرف یہ سب کچھ اُن سے کہلوانا چاہتے تھے۔“

آنسوؤں میرے رخساروں سے نیچے ڈھلک رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا۔ ”مجھے فخر ہے کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ثابت قدم رہے۔ وہ ایک دیاندار اور کھرے آدمی تھے اور اس کردار کو انہوں نے مرتے وقت تک نبھایا۔ وہ ممکنہ حد تک اس کے علاوہ کچھ کربھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے بعد میں اپنے بچوں کی طرف مڑی اور ان سے کہا۔ ”بچو! تم نے خود سُن لیا ہے کہ تمہارے بابا نے کس بہادری کے ساتھ موت قبول کی ہے جو تمہارے لیے ایک سبق ہے۔ اگر تم سے ہو سکے تو تم بھی فرض کے ساتھ لگن کی اس مثال کو اپنالو۔ تم خوش نصیب اولاد ہو۔ کیونکہ تمہارا باپ ایک بہادر ہستی تھی۔“

ہم سب نے خاموشی کے ساتھ یہ عہد کیا کہ ہم کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے اُن کی شہادت کی رُوح مجروح ہوتی ہو یا اُن کی رُوح کو دکھ پہنچے۔ میں نہیں سمجھتی کہ بچوں نے وہ ساری بات یاد کر لی ہوگی جو میں خود انہیں بتانا چاہتی تھی۔ میں خود غم و اندوہ اور مدح و توصیف کے جذبات سے مغلوب تھی۔ اور جو کچھ میں نے کہا وہ اس طرح تھا جیسے کوئی خبطی بول رہا ہو۔

میرے رنج و غم کی دیوانگی بتدریج کم ہوتی گئی۔ میں اُن کی قربانی کی عظمت سے بے حد متاثر تھی بلکہ یہ تصور کسی حد تک میرے لیے باعثِ تشفی بھی تھا۔ اب میں نے اپنی بیٹیوں کے بارے سوچنا شروع کیا تو میری تشویش میں پھر اضافہ ہو گیا۔



## ایک نتیجہ خیز انٹرویو

تیسرے روز ہمیں تھوڑی سی روٹی اور کچھ گوشت کھانے کو دیئے گئے۔ کچھ لوگ خوش تھے کہ آخر کھانے کو کچھ تو ملا۔ لیکن زیادہ تر لوگوں نے حملہ آوروں سے کھانا لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے وہ پڑوس کے کھیتوں میں چلے گئے اور وہاں سے گنے لے کر آ گئے۔ فصل پکی ہوئی تھی اور کٹنے کے لیے تیار تھی۔ طویل مصائب نے انہیں جزوی طور پر بے حس کر دیا تھا اور وہ اس قدر بھوکے تھے کہ انہیں اخلاقیات کے کسی سبق کی پرواہ نہیں تھی۔ انہوں نے گنے کے ٹانڈے کاٹے اور انہیں چبانے لگے لیکن ساتھ ہی بے بس بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے جا رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس کے بعد ہمیں باقاعدہ راشن ملا کرے گا۔ جب بھی دوسری خواتین میں کسی قسم کی کوئی حرکت نظر آتی تھی اور وہ خفیہ طور پر خوف زدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی تھیں تو میں اپنی بیٹیوں کے خیال میں غرق ہو جاتی تھی۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ اس گولگو کی وجہ کیا ہے تو معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کا روزمرہ کا معمول بن گیا ہے کہ وہ جیل کے سیلز میں داخل ہو جاتے ہیں، خواتین کا جائزہ لیتے ہیں اور انہیں اپنے لیے خود منتخب کرتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے وہ رات کے پچھلے پہر آتے ہیں اور منتخب کردہ خواتین کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اگر ان خواتین کی گود میں بچے ہوں تو انہیں چھین کر زمین پر پٹک دیتے ہیں اور اُن کی ماؤں کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ تین دن تک یوں ہی ہوتا رہا۔ بہت سی خواتین اس بدنامی کو برداشت نہ کر سکیں تو انہوں نے زہر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ خواتین نے کھڑکیوں کے شیشے توڑ کر اُن کے ٹکڑے کھا کر اپنی زندگیاں ختم کیں۔ لیکن موت بھی انہیں آسانی سے آزادی نہیں دیتی تھیں کہ اُن کو مہلک اور دردناک عذاب میں دیکھنے کا منظر بے حد دل شکن اور اذیت ناک تھا۔ اُن کے باپوں اور شوہروں کے لیے بھی آہستہ آہستہ بے رحم موت مرنے کے اس عمل کا منظر ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے جب وارڈرزد دیکھ نہیں رہے ہوتے تھے تو وہ جیل سے نکل کر اپنے پیاروں کو دریا میں پھینکتے تھے تاکہ اُن کا دکھ اور درد بھی ساتھ ہی ڈوب جائے۔ اس کے باوجود حملہ آوروں نے دریا سے بھی کئی عورتوں کو کھینچ کر باہر نکال لیا اور خود کشی کے ذریعے اُن کی



اپنی حفاظت کی کوشش بھی ناکام بنا دی گئی۔

حملہ آور اس پر راضی ہو گئے تھے کہ ہم میں سے کچھ مرد اُن کے ساتھ جائیں اور ہمارے لیے راشن لے کر آئیں۔ شیوا دیال نے کچھ گنے اور کئی اگٹھی کر لی تھی۔ بچوں نے یہ بہت رغبت سے کھائی انہوں نے گزشتہ دو روز سے فی الواقع کچھ بھی نہیں کھایا تھا لیکن مجھے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جب رنج و غم انسان کی زندگی میں زندہ رہنے کے لیے جواز کی حیثیت اختیار کر لے اور اُس پر چھا جائے تو محض غذا اُسے زندہ رکھنے کے لیے ضروری نہیں ہوتی۔

میں نے بہت کوشش کی کہ میں اپنے شوہر کی موت کو بہادری سے برداشت کروں لیکن اُن کی جدائی کا غم مسلسل میرے انگ انگ کو کاٹ کر کھائے جا رہا تھا۔ کیونکہ میری زندگی کا واحد جواز وہی تھے جو ختم ہو گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک احساسِ جرم کہ شاید میرے شوہر نے آخری وقت میں مجھے بزدل اور بھگوڑا سمجھا ہو، میرے لیے اذیت ناک ثابت ہو رہا تھا۔ اگر کبھی خواب میں بھی آ کر انہوں نے مجھے کہہ دیا ہوتا کہ میں نے بچوں کی خاطر گھر چھوڑ کر اچھا کیا تو میں اسے معافی کا سرٹیفکیٹ سمجھ کر مطمئن ہو سکتی تھی۔ اگر میں قائل ہو سکتی کہ میرے شوہر نے اپنے آخری لمحات میں مجھے بزدل نہیں سمجھا تو پھر بھی میں اپنا سروکار اور فخر سے بلند رکھ سکتی تھی اور شاید پھر میں اُن کی قربانی کے مفہوم کے ذریعے مزید اہمیت بھی حاصل کر سکتی تھی۔ بزدلی اور آنسو تو اُن کی یاد کے لیے پھولوں کے ہار ثابت نہیں ہو سکتے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میرا فرض صرف یہ ہے کہ میں اپنے بچوں کی حوصلہ افزائی کروں اور انہیں خوش رکھوں۔ تاکہ وہ شرم اور شکست کے احساسات سے مغلوب نہ ہو جائیں۔

جیل میں ہمیں چند ہی گھنٹے گزرے ہوں گے جب ایک نو جوان میرے پاس آیا اور کہنے لگا ”میرا نام چمن لال ہے۔ وزیر صاحب اور میں اچھے دوست تھے۔ یہ خدا کی مرضی تھی کہ وہ اُس کے کسی بڑے مقصد کو پورا کریں۔ میں آپ کے پاس پاکستان کے ایک چیف، جو اس وقت آپ کے بنگلے میں ہے، کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ مظفر آباد کا سارا انتظام اُس کے ہاتھ میں ہے۔ اُس نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ دراصل اُس کا بھائی بھی میرے ساتھ آیا ہے جو باہر انتظار کر رہا ہے۔ وہ آپ کو حفاظت سے وہاں پہنچا دے گا۔“

میرا سارا جسم لرز اٹھا اور مجھ پر خوف طاری ہو گیا کہ شاید اب بدترین ہونے والا ہے۔ مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا جو یہ سوچا کہ شاید میں بچ جاؤں۔ اب میرے پاس بھی وہی چارہ کار تھا جس کے ذریعے بہت سی خواتین پہلے ہی اپنی جان دے چکی تھیں۔ اب موت کے ذریعے آزادی حاصل کرنے اور بے

عزتی اور آبروریزی برداشت کرنے، جو زندہ رہنے کے لیے حملہ آوروں کا مطالبہ تھا، کے درمیان انتخاب کا وقت آن پہنچا تھا۔ موت دوسروں کی طرح میرے لیے بھی نسبتاً آسان حل تھا۔

میں نے اپنے بالوں سے سُرخ ڈوری کا ایک ٹکڑا کھولا جو میری شادی کے وقت میرے سرال نے میرے بالوں میں باندھا تھا۔ یہ ایک مقدس نشانی بھی تھی اور ماضی کی علامت بھی۔ جس پر میں طاقت کے حصول کے لیے اب بھی انحصار کرتی تھی۔ کسی کو دکھائے بغیر کہ میں کیا کر رہی ہوں، میں نے پوری طاقت سے اپنے گلے کو اُس سُرخ ڈوری سے باندھا اور کچھ وقت کے لیے بے ہوش سی ہو گئی اور ہوش میں اُس وقت آئی جب دیکھا کہ اُدم پر کاش اور چمن لال مجھ پر جھکے ہوئے ہیں اور اُن کے چہرے پر تفکر کے آثار ہیں۔ انہوں نے میرے چہرے پر پانی چھڑکنا کہ میں ہوش میں آ جاؤں اور پھر میرے گلے کے ارد گرد ڈوری کی گانٹھ ڈھیلی کر کے اس کو نکال دیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔ کیوں نہ میں اپنی ساری طاقت کو اکٹھا کر کے صورتِ حال کا مقابلہ کروں؟ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے شوہر کی شایانِ شان بن کر دکھانے کی ضرورت ہے۔ آخر کار میرے اندر اب بھی خفہ قوت کے ذخائر موجود ہوں گے جنہیں سامنے لا کر استعمال کرنا ضروری ہے۔ اپنے آپ کو نیکو کار ثابت کرنے کے زعم کو ہمیشہ قابلِ نفرت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کبھی تو یہ سوچ بھی ناگزیر معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ سیدھے سادے عقیدے کی پیروی میں اطمینانِ قلب تلاش کرتے ہیں بسا اوقات وہ بھی ناقابلِ برداشت حد تک نیکی اور پارسائی کے دعوے دار معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مجھے ایک حادثہ یاد آ گیا جو اُس وقت رُونا ہوا تھا جب میرے شوہر ابھی بقیہ حیات تھے۔ میں نے ایک مرتبہ قدرے شیخی بگھارتے ہوئے اور بڑی سنجیدگی سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اگر کوئی عورت اپنے عقیدے اور نظم و ضبط کے معاملے میں مضبوط اور سخت گیر ہو تو وہ ہزاروں مردوں کو مدح اور توصیف کے ساتھ ساتھ اپنی قربان گاہ پر عبادت کے لیے بھی مجبور کر سکتی ہے۔ میرے شوہر نے میرے اس دعوے کو ہنسی میں اڑا دیا تھا۔ یہاں ابھی اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کا وقت آ گیا تھا اور اگر میں نے مجروح ہوئے بغیر صورتِ حال کا مقابلہ کر لیا تو شاید مجھے اپنے شوہر کی روح کے سامنے احساسِ جرم کی ضرورت نہ رہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پاکستانی چیف کو ملنے کے لیے ضرور جاؤں گی۔

میں نے چمن لال سے پوچھا۔ ”وہ آدمی کہاں ہے جو تمہارے ساتھ آیا تھا؟ اُسے اندر لے آؤ۔“ میرا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔ میں نے ابھی ابھی خودکشی کی جو کوشش کی تھی اُس کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی۔ میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو آنے والے غیر یقینی مقدر کے سفر کے لیے تیار کر رہی تھی۔

اتنے میں چمن لال دو آدمیوں کو لے کر اندر داخل ہوا۔ انہوں نے مجھے شاہانہ طریقے سے سیلوٹ کیا اور کہا ”ہمارے چیف نے ہمیں آپ کو لینے کے لیے بھیجا ہے۔“ میں نے صرف اس شرط پر اُن کے ساتھ جانے پر اتفاق کیا کہ میرے بچے اور ملازم بھی میرے ساتھ جائیں گے۔ اس طرح ہم واپس اپنے تباہ شدہ گھر کی طرف جانے کے لیے روانہ ہوئے، جہاں کل تک ہم کسی قسم کے رنج و غم سے واقف نہ تھے وہ راستہ جس پر کبھی ہم لا پرواہی اور ست روی سے چلا کرتے تھے آج ہم اُس پر چیتھڑوں میں ملبوس ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ میں اپنے مقدّر کے تیز تر اُتار چڑھاؤ کے تھوڑے قدرے فرحت محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

ہمارے بنگلے میں زیادہ کچھ بچا ہوا نہیں تھا۔ جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی جلی ہوئی باقیات کا وسیع اور ہولناک میدان نظر آرہا تھا۔ حملہ آوروں کی آگ سے صرف باورچی خانہ اور مہمان خانے کے کمرے بچے ہوئے تھے۔ مکان کی جگہ مسلح حملہ آوروں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ مجھے چیف کے پاس لے جایا گیا جو اس وقت حملہ آوروں کے ایک گروہ کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ وہ بھی ایک قبائلی تھا اور لگ بھگ پچاس سال کی عمر کا ہوا ہوگا۔ اس نے شلوار اور قمیض پہن رکھی تھی۔ بندوق اُس کے کندھوں پر لٹک رہی تھی۔ اور اُس کی کمر کے ارد گرد ایک پیٹی کے ساتھ گولیوں کا بکس منسلک تھا۔ یہ تمام تفصیل جاننے میں مجھے زیادہ دیر نہ لگی۔ میں نے شائستگی سے اُسے سلام کیا اور کہا ”برائے مہربانی ایک غریب خاتون کا سلام قبول کریں۔“

اُس نے کچھ بھی کہنے سے قبل مجھے کڑی نظروں سے دیکھا ”آپ کو میرے ساتھ یوں شائستہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے وزیر صاحب کی موت کا بہت افسوس ہے۔ وہ شیردل آدمی تھا۔“ مجھے اس کی گفتگو کے دوران مداخلت کر کے یہ کہتے ہوئے حیرت ہو رہی تھی۔ ”خان صاحب! آپ کو اُن کی موت پر افسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ بزدل نہیں تھے، نہ خوف کے مارے انہوں نے اپنا مذہب چھپایا اور نہ ہی اپنے فرض میں کوتاہی کی۔ اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتا تو اُن کی موت پر افسوس کرنا مناسب ہو سکتا تھا۔ میں اپنے آپ کو ایسے شخص کی بیوی ہونے پر خوش نصیب سمجھتی ہوں کیونکہ وہ فی الواقع بڑے آدمی تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے بیٹے بھی اُن کی قائم کی ہوئی روایت کو برقرار رکھیں۔ مجھے صرف اس ایک بات ہی سے بہت خوشی ہوگی، اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے بیٹے بھی کسی ایسے موقع پر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کر دیں گے۔ اگر آپ نے اسلام کے نام پر ہمیں قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو فوراً اپنے لوگوں کو ہم پر فائر کھولنے کا حکم صادر کریں اور دیکھیں کہ میرے بچے کس بہادری سے موت کا سامنا کریں گے۔ بچوں نے بھی میری توقع کے عین مطابق کھڑے ہو کر قدم آگے بڑھا دیئے۔ آنکھیں بند کیں اور خان سے کہا کہ اپنے آدمیوں کو حکم دو کہ وہ

ہمیں ٹوٹ کر دیں۔“

ارد گرد کھڑے سارے لوگ اس منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ میرے سامنے جو محافظ کھڑا تھا اُس نے اپنی بندوق قبور (چمڑے کی تھیلی) میں ڈال دی، بچوں کے قریب آ کر اپنی بانہیں اُن کے گرد حائل کر دیں۔ خان کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں جب اُس نے کہا ”بہن جی! آپ کے بچے بہت آگے اور دُور جائیں گے۔ آپ ایک ایسی ماں ہیں جس پر ہر شخص رشک کرے گا کہ آپ کے معصوم بچے اس قدر بے خوف ہیں۔ میں نے گزشتہ چار دنوں میں کسی ایک کو بھی بے خونی سے اپنا سامنا کرتے ہوئے نہیں پایا۔“

وہ مجھے اپنے نیک عزائم کے بارے یقین دلانا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا ”آپ اب بھی ہمارے لیے اسی طرح وزیرِ نی کی حیثیت رکھتی ہیں جس طرح آپ اپنے شوہر کی موجودگی میں تھیں۔ ہم سب آپ کا بہت احترام کرتے ہیں۔ برائے مہربانی اپنے آپ کو آرام دہ بنائیں اور ساتھ ہی میں یہ بھی کروں گا کہ آپ کی بیٹیوں کو واپس آپ کے پاس پہنچاؤں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں۔ مقامی مسلمانوں کا ایک خاندان جو قریب ہی رہتا ہے، وہ اُس کے پاس ہیں۔ میرا ایک آدمی معمول کی گشت کے دوران وہاں گیا تھا۔ وہاں اُسے نوجوان لڑکیاں نظر آئیں جنہوں نے اُسے بتایا کہ وہ وزیرِ صاحب کی بیٹیاں ہیں۔ انہیں دو قبائلی لے کر آئے تھے جنہوں نے ایک مسلمان خاندان کو اُن لڑکیوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کہا تھا۔ میرے آدمی نے لڑکیوں سے پوچھا کہ کیا وہ قبائلیوں پر اعتماد کریں گی؟ ”ہاں بالکل! ہم یقیناً اُن پر اعتماد کریں گی۔“ آپ کی بیٹیوں کا جواب تھا۔ انہوں نے کہا ”ہمارا اس گھر میں بہت خیال رکھا گیا ہے۔ قبائلی دراصل اس سے قبل ہمیں دو اور گھروں میں لے گئے تھے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ حملہ آور اکثر ان گھروں میں آتے رہتے ہیں اس لیے وہ ہمیں یہاں لے کر آ گئے۔“

درحقیقت انہیں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ جیل میں ہیں اور یہ اُن کی صحیح صحیح اور خوبصورت وضاحت سے ممکن ہوا کہ میرا آدمی آپ کو جیل میں شناخت کر سکا۔ اس کے علاوہ آپ کی بیٹیوں نے اُس وقت تک میرے آدمیوں کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا جب تک آپ انہیں اجازت نہ دیں۔ کیا آپ میرے آدمی کو کسی قسم کی کوئی نشانی دینا پسند کریں گی جس سے انہیں معلوم ہو سکے کہ آپ یہاں ہیں؟۔ میرے آدمی انہیں یہاں آپ کے پاس لے آئیں گے۔“

میں نے ایسا ہی کیا اور ایک آدمی میری بیٹیوں کو لینے کے لیے چلا گیا۔





## تباہ شدہ گھر میں

ہم واپس اپنے گھر آ گئے۔ بلکہ اُس بلے پر جو کبھی ہمارا گھر ہوا کرتا تھا۔ میں بمشکل چل سکتی تھی۔ تاہم سب سے پہلے اُس بیڈروم میں گئی جہاں میرے شوہر کو گولی ماری گئی تھی۔ اُن کی میت اُس آگ کی نذر ہوئی جس نے بنگلے کو بھی خاکستر کر دیا تھا۔ اُن کے جسم میں سے جو کچھ باقی بچا تھا وہ راکھ تھی جو سارے فرش پر بکھری ہوئی تھی۔ راکھ کے یہ ذرے مجھے یاد دلانے کے لیے کافی تھے کہ اُن کی موت حقیقت بن چکی ہے۔ اُس وقت تک تو میں لاشعوری طور پر اس تصویر کی مزاحمت کرتی رہی تھی لیکن جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑا۔ اُن کی لمبی اور خوبصورت شخصیت کا ہیولا اور مختلف اور متنوع حالات میں اُن کا رنگین تازہ دم چہرہ اچانک چمک کی طرح میرے ذہن میں گھوم گیا اور پھر کوئی چیز مجھے اندر سے کاٹنے لگی اور مکمل تاریکی چھا گئی۔

میں تنہائی محسوس کرنے لگی۔ ایسے میں میرا غم مجھے پچکار کر آرام پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ عجیب سی بات تھی۔ وہ رُکا وٹیں جو آدمی کے برتاؤ کو عام طور پر قابل قبول بنا دیتی ہیں اچانک پیچھے ہٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مجھے ایک مختلف دنیا میں اپنے وقتی اور عارضی وجود کا شدت سے احساس تھا، جس کے ساتھ احساس اور اظہار کے کچھ دیگر نمونے بھی وابستہ تھے۔ دوسروں کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی وہ وہاں پہنچ سکتے تھے۔ وہ لوگ جو میرے ارد گرد تھے شاید مجھے عجیب سمجھتے تھے اور اسی لیے جب میں نے بات کی تو وہ مجھے تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے قبائلیوں کو بتایا کہ چونکہ میں اپنے شوہر کے لیے آخری رسومات ادا کرنے لگی ہوں اس لیے وہ میرے اسمبل میں حائل نہ ہوں۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ راکھ آپ کے شوہر ہی کی ہے؟ ہم نے ایک خاکروب کو اُس کی باقیات کی جگہ کی صفائی کے لیے کہا تھا۔“ ایک شریر آواز نے مذاقاً کہا۔

لیکن میں جانتی تھی۔ ایک جانی پہچانی خوشبو اب بھی کمرے میں اُن کی موجودگی کا پتا دے رہی تھی۔ میں نے اپنے دوپٹے سے ایک ٹکڑا پھاڑا اور اُن کی راکھ کو فرش سے اکٹھا کر کے اُس میں ڈال دیا۔ جب

میں راکھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر باہر آئی تو میں نے اپنی بیٹیوں کو خان کے ساتھ اندر آتے ہوئے دیکھا۔ انہیں دوبارہ پا کر مجھے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن غم و اندوہ نے مجھے شکستہ دل اور دیوانہ کر دیا تھا۔ میں اُن پر چلائی ”بزدلو! تم اپنی زندگی کو اپنی عزت سے زیادہ اہمیت دیتی ہو جبکہ میں نے تمہیں بتایا ہوا تھا کہ کیا کرنا ہے۔“

وہ اس طرح کے عجیب ’اسقبال‘ کی توقع نہیں رکھتی تھیں۔ انہوں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”ماں! ہم نے یقیناً وہی کیا ہوتا جو آپ نے بتایا تھا، اگر یہ ضروری ہوتا تو۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ یہ ضروری نہیں تھا؟“ وہ آدمی بھی جو انہیں لینے گیا تھا، مجھے یقین دلانے لگا اور کہنے لگا کہ ”میڈم! آپ کی بیٹیاں اس سلوک کی مستحق نہیں ہیں۔ وہ بڑی باہمت ہیں۔ پہلی مرتبہ جب خان کے حکم کے تحت میں انہیں لینے گیا تو انہوں نے اُس وقت تک میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا جب تک آپ خود انہیں آنے کا حکم نہ کریں۔“

بیٹیوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”پاپا کہاں ہیں؟“ میں نے انہیں راکھ دکھائی۔ میں جانتی تھی کہ میں اُن کے ساتھ بہت ظلم کر رہی ہوں لیکن میں غم کے مارے بدحواس ہو چکی تھی اس لیے یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہ کر سکی کہ یہ خبر اُن پر کیا ستم ڈھائے گی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور اُن کے آنسوؤں نے مجھے قدرے خاموش اور پرسکون کر دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ اُن کے باپ نے بڑی بہادری سے جان کی بازی لگائی اور اپنی زندگی سچائی کے لیے قربان کر دی۔ انہیں بھی بہادری کا ثبوت دینا چاہیے اور اُن لوگوں کے سامنے چیخ و پکار نہیں کرنی چاہیے جنہوں نے انہیں قتل کیا ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ حرکت کبھی پسند نہ کرتے۔ انہوں نے اپنی سسکیوں کو مدھم تو کر لیا لیکن ننھی سویدش اس قدر دل گرفتہ تھی کہ اُسے خاموش کرنا بہت مشکل تھا۔

میں راکھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر صحن میں بیٹھ گئی۔ میں نے راکھ کا بندل اپنی جھولی میں رکھ لیا اور ہاتھ باندھ کر طاقت اور جرات کے لیے دُعا کرنے لگی تاکہ میں اپنے زیاں کو برداشت کر سکوں اور اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک اپنے فرض کو نبھاسکوں۔ بچے اور قبائلی میرے پاس کھڑے ہو کر خاموشی سے سُننے لگے کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔ جب میں نے دُعا ختم کی تو خان نے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ ہمارے لیے تین کمرے خالی کر دیں۔ ساتھ ہی وہ باورچی خانے سے کچھ برتن بھی لے کر آئے تاکہ ہم وہ راشن پکاسکیں جو انہوں نے ہمیں دیا تھا۔

مجھے ساٹھی چاہیے تھا۔ میں کسی قریبی دوست کی موجودگی اور خاموش افہام و تفہیم (Understanding) کی خواہشمند تھی، جو میری ذات کے نہاں خانوں تک اُتر سکے۔ مجھے سنت رام مووی کی یاد آرہی تھی جسے میں اپنے بچپن سے ”ماسی جی“ کے نام سے جانتی تھی۔ وہ انتہائی مہربان اور شریف النفس

خاتون تھی۔ اس لیے میں نے خان سے درخواست کی کہ اُسے میری خاطر جیل سے لانے کی اجازت دی جائے۔ خان کافی مہربان تھا اور جلد ہی ”ماسی جی“ کو ایک چار پائی پر اٹھا کر گھر کے اندر لایا گیا۔ کملا جو مودی جی کے دفتر کے ایک کلرک کی بیٹی تھی، بھی اُس کے ساتھ تھی۔ لیکن ماسی جی کے کپڑے خون سے لت پت تھے اور وہ بمشکل سانس لے رہی تھی۔

میں دوڑ کر چار پائی کے پاس گئی تاکہ اُس کا استقبال کروں۔ اُس کے معدے میں گولی لگی ہوئی تھی اور خون اب بھی اُس کے زخم سے باہر آ رہا تھا۔ اُسے شدید کھانسی اور بلغم کا عارضہ بھی تھا۔ میں نے اُس کے شوہر، اُس کے بیٹے اور کملا کے بارے پوچھا۔ وہ درد کے مارے بڑی مشکل سے بول سکی اور اُس کی حالت نے مجھے نیست و نابود کرنے والی ابدیت کی یاد دلائی۔ ”کملا کا باپ مارا جا چکا تھا۔“ اُس نے کہا۔ ”وہ کشمیری پنڈت تھا۔“ دوسروں کے بارے اُس کے پاس کوئی یقینی اطلاع نہیں تھی۔ ماسی جی ہمارے ساتھ رہنے پر تیار ہو گئی اور اس طرح اب ہماری تعداد بارہ ہو گئی تھی، جن میں سات بچے اور پانچ بڑے تھے۔ تمام بچے بہت بھوکے تھے اس لیے میں نے اُوم سے کہا کہ وہ کھانا تیار کرنے کا اہتمام کرے۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو بچوں نے گزشتہ چار دنوں کے بعد پہلی مرتبہ جی بھر کر کھانا کھایا۔ مسز مودی اور میں نے کچھ نہ کھایا کیونکہ ہم کھا ہی نہیں سکتی تھیں۔

خان نے اپنا عملہ ڈاکٹر کے بنگلے میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سپاہی اور قبائلی باورچی خانے میں کھانا تیار کرنے کی غرض سے وہیں رہ گئے۔ جانے سے پہلے خان میرے دروازے پر آیا اور بلند آواز میں کہا۔ ”بہن جی! مہربانی کر کے مجھے ضرور بتانا کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے دو آدمیوں کو بتا دیا ہے کہ وہ آپ کے کمروں کی حفاظت کریں گے۔ کیونکہ یہاں کی راتیں اب بھی محفوظ نہیں۔“ میں نے اُس کی تمام مہربانیوں کے لیے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

ہمارے گھر کی جھلسی ہوئی دیواروں کے تیز دھار سائے بڑھتے اور پھیلتے گئے۔ ہم اب پہلے سے بہتر اور محفوظ تھے لیکن تاریکی کے ساتھ ساتھ اُداسی بھی لوٹ کر آ گئی۔ بچے بہت تھکے ماندے تھے اس لیے کھانا کھانے کے فوراً بعد سو گئے۔ آج دوسرے روز وہ بے غم ہو کر سوئے تھے، جب انہیں صبح کی کوئی فکر نہ تھی۔ آج وہ قبائلی سردار کے مہمان کے طور پر اپنے گھر واپس لوٹے تھے جس میں اُن کے باپ کو قتل کیا گیا تھا۔ میں اُن کے باپ کی راکھ کو اپنی گود میں لے کر اُن کے قریب بیٹھ کر دُعا کرنے لگی کہ خُدا ہمیں مستقبل کی مشکلات برداشت کرنے کی ہمت اور طاقت عطا فرمائے۔ رات کے خاموش پہروں کے دوران میری نگرانی (Vigil) سورج طلوع ہونے کے بعد ختم ہوئی تو میں نے اپنے بیٹوں کو اپنے باپ کی راکھ کرشن گنگا میں بہانے کے لیے دو میل

جانے کو کہا۔

ہندو گھرانے میں یہ ایک طے شدہ رسم ہے کہ بڑا بیٹا اپنے والدین کے لیے آخری رسومات ادا کرتا ہے۔ جب بیٹا بالغ ہو جاتا ہے تو اُسے ایک متبرک دھاگہ دیا جاتا ہے جو اُسے اپنی چھاتی کے ارد گرد اور بائیں کندھے کے اوپر باندھنا ہوتا ہے جو ”اپنیانا“ کہلاتا ہے اور ایک رسم (Ceremonial) کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اُسے ”برہمچاریہ“ کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے اور اُسے فرائض ادا کرنے کی رعایت مل گئی ہے۔ اُس کا سب سے پہلا اور اہم فرض اُس کی ماں کے لیے ہے، اس کے بعد ”گرڈ“ اور باپ کے لیے ہے۔

میں نے شیوا دیال کو کہا کہ وہ لڑکوں کے ساتھ جائے لیکن فوراً ہی مجھے خیال آ گیا کہ ان دنوں ہندوؤں کے لیے تنہا باہر نکلنا بے حد غیر محفوظ ہے۔ میں نے ویمل کو خان کے پاس بھیجا کہ وہ انہیں ایک محافظ دستہ عنایت کرے۔ خان نے مہربانی فرماتے ہوئے نہ صرف اپنے آدمیوں میں سے ایک آدمی دیا بلکہ اپنی کار بھی عنایت کی۔ میرے دونوں بیٹے، اوم اور محافظ کے ساتھ کار میں بیٹھ کر دو میل گئے اور ایک گھنٹے بعد واپس آ گئے۔

دونوں حملہ آور چیف واپس محاذ پر جا رہے تھے جب وہ مجھے الوداع کہنے آئے تو خان میرے ساتھ گویا ہوا۔ ”بہن! آپ کو کسی چیز کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ ہم رات ہونے سے پہلے واپس آ جائیں گے۔ کیا آپ ہماری کامیابی کی دعا نہیں کریں گی؟“ میں نے کہا۔ ”جناب! میری خواہش ہوگی کہ آپ صحیح اور غلط کا فیصلہ خود کریں۔ بہر حال کسی ملک کو فتح کرنے کا یہ درست طریقہ نہیں ہے کہ آپ لوٹ مار کریں اور خواتین کی آبروریزی کریں۔ شاید آپ کا خُدا الگ ہو لیکن جو چیز فی الواقع اچھی ہے وہ کسی مذہب سے ہٹ کر بھی اچھی ہی کہلائے گی۔“

ان لوگوں نے میرے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا اور میں جانتی تھی کہ میں اس طرح کی باتیں کر کے اُن کے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہوں۔ لیکن خان میں کافی قوت برداشت تھی اور وہ غصہ میں آئے بغیر دلیل کو تسلیم کرنے پر آمادہ تھا۔ وہ بالکل پرسکون اور متوازن رہا اور خاموش یقین دہانی کے ساتھ کہا۔ ”میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ سب کچھ ماضی میں ہوتا رہا ہے لیکن میں اس بات کا خیال رکھوں گا کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔“





## جنگ کے بادل

گزشتہ چار روز سے نہ تو میں نیغسل کیا تھا اور نہ ہی کپڑے تبدیل کیے تھے۔ میں اپنے آپ کو بہت بو جھل اور غیر مصفا محسوس کرتی تھی اس لیے مجھے غسل کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں صاف کپڑوں کا ایک آدھ جوڑا کہاں سے لاؤں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میرے کچھ کپڑے اب بھی دھوبی کے پاس ہیں۔ میں نے شیوا دیال اور ایک سپاہی کو کپڑے لینے کے لیے بھیجا لیکن دھوبی نے کپڑے واپس دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ حملہ آوروں نے اُس کا گھر لوٹ لیا ہے۔ لیکن جب سپاہی نے اصرار کیا تو دھوبی نے میری ایک ساڑھی اور بلاؤز تلاش کر کے دے دیے۔ گھر میں صابن بھی نہیں تھا۔ حملہ آور سب کچھ لے جا چکے تھے۔ میں جانتی تھی کہ آٹے کا پیسٹ (Paste) صابن کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نے راشن کے آٹے سے کچھ پیسٹ تیار کیا۔ مجھے سردھونے میں بہت دقت پیش آرہی تھی کیونکہ میں اس قدر کمزور تھی کہ ٹانگوں کے بل زیادہ دیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ آج پانچویں روز تو بمشکل مجھے پورا کھانا ملا تھا۔

میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم غیر معینہ مدت تک خان کے مہمان بن کر رہیں۔ میں نے بچوں کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ ”میں سوچتی ہوں کہ ہمارے لیے یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے کہ ہم کچھ کئے بغیر خان کا کھانا قبول کرتے رہیں۔ ہمیں اُس کی خیرات پر زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ اس لیے میں خان سے کہوں گی کہ وہ ہم سب کو کوئی نہ کوئی کام دے۔ ہم نے سب کچھ کھو دیا ہے لیکن یہ انتہائی شرم کی بات ہوگی کہ ہم دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ رہ کر اپنی عزت و وقار بھی ضائع کر دیں۔“

اسی اثناء میں کھانا بھی تیار ہو گیا اور جو دھا جو ماسی جی کا باورچی تھا، اصرار کرنے لگا کہ میں کچھ کھالوں۔ کچھ وقت سے اب تک میں اپنی نفی کرنے کے موڈ میں رہی ہوں۔ میں محسوس کرتی تھی کہ میں کچھ نہ کچھ کھا کر اپنے غم کو غلط کر سکتی ہوں۔ کبھی کبھی یہ روئی نیکی کے شاندار زعم میں مبتلا کر دیتا تھا۔ کسی حوالے سے اپنی

ذات کی یہ نفی مجھے صفائی اور پاکیزگی کا احساس دلانے کا باعث بھی بن جاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں مزید کسی فاقہ کشی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس طرح اگر میں مزید کمزور ہو گئی تو اپنے بچوں کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گی۔ ایک سمجھوتے کے تحت میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں دن میں ایک مرتبہ کھانا ضرور کھاؤں گی۔

دوپہر کے وقت کئی مقامی مسلمان ملنے کے لیے آئے۔ وہ ہمدردی کا اظہار کرنے آرہے تھے۔ لیکن میں نے اُن پر اپنی ناراضگی واضح کر دی۔ وہ مجھے یہ بتانے کے لیے بیٹھے رہے کہ وزیر صاحب نے کتنی بہادری سے اپنے فرائض انجام دیے اور بالآخر اپنی جان تک بھی دے دی۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔ ”اُس روز جو بد نصیبی کا دن تھا وزیر صاحب کو ہم نے بلا خوف و خطر شہر بھر میں گھومتے ہوئے دیکھا۔ وہ سب سے زیادہ فکرمند اس لیے تھے کہ صحیح صحیح خبریں حکام بالاتک پہنچ سکیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ہمارے انتباہ کی کوئی پرواہ نہ کی۔ انہوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے اور وہ ہمارے ان مشوروں کو کہ ”کہیں پناہ لے لیں“ محض تفریح طبع کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ لوگ اب بھی اُن کے بارے باتیں کرتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ انہیں ابھی تک مناسب طریقے سے خراج عقیدت پیش نہیں کر سکے۔“

دوسرے لوگ بھی جو اُن کے بعد آئے، اُن کی شہادت کی مدح سرائی کرتے رہے اور میں خوش تھی کہ ان میں ایک بھی آہ ایسی نہیں تھی جو خالی خالی غم کا اظہار کرتی ہو۔

قبائلیوں نے ابھی تک ہمارا بنگلہ خالی نہیں کیا تھا۔ وہ مسلسل باورچی خانہ استعمال کر رہے تھے اور بار بار بارگروہوں کی شکل میں ہماری کھڑکی کے قریب سے گزرتے تھے۔ اُن میں سے کچھ تو کھڑے ہو کر کھڑکی کے شیشوں سے اندر جھانکتے تھے اور ہم پر آوازے کستے تھے۔ ”ہم اپنی مشرقی پنجاب کی عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لیں گے۔“

میں اُن کے ساتھ مکالمہ کرتی تھی۔ ”آپ اس وقت ناراض ہیں لیکن آپ ذرا خاموشی سے لمحہ بھر کے لیے سوچتے کیوں نہیں؟ دو غلطیاں مل کر بھی ایک سچ یا صداقت نہیں بن سکتیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ یہاں کے لوگوں کو کسی ایسے واقعہ کی وجہ سے جو میلوں دور ہوا ہے تنگ کر کے اور دکھ دے کر کیا حاصل کر پائیں گے؟ لیکن اُن کے پاس میرے لیے صبر و ضبط نہیں تھا۔ اس طرح اپنے طویل اور خالی پہروں کے ساتھ ایک اور دن بہت آہستہ آہستہ گزر سکا۔

تاریکی ہوتے ہی رات عجیب و غریب ہیولے اور شکلیں لے کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ کبھی کبھی تو وہ خوف و دہشت طاری کرنے والی تھی لیکن اکثر ڈراؤنی اور بدہیت ہوتی تھی۔ لیکن میرے لیے تاریکی میں بھی کوئی

خوف نہیں تھا کیوں کہ مجھے پہلے ہی مبہم سا احساس ہو گیا تھا کہ مستقبل حال سے زیادہ بددلی اور مایوسی کا باعث ہو سکتا ہے۔ میں خوفزدہ نہیں تھی بلکہ محض شکستہ دل اور پڑمرده موڈ کا شکار تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں رات کی تاریکی میں کسی جانے پہچانے راستے پر مگر بلا مقصد انجانی منزل کی جانب رواں دواں ہوں۔ رات کی گھڑیاں بے رحمی سے گزر رہی تھیں اور میرا ذہن بلاوجہ رات سے عبارت شکلوں اور خاکوں کے تصور سے بھرا ہوا تھا۔ مسز مودی جو میرے ساتھ والے بستر پر سوئی ہوئی تھی مسلسل کھانسنے لگی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کی پٹت سے اُس کی پیشانی کو چھوا۔ وہ تیز بخار میں مبتلا تھی۔

دونوں قبائلی چیف صبح میرے پاس آئے۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔ ”بہن جی! ہمارا مشورہ مانیں تو آپ ایبٹ آباد چلی جائیں اور وہیں رہائش اختیار کر لیں۔ ہم آپ کو ایک بنگلہ دے دیں گے اور آپ کے بچوں کی تعلیم کا بندوبست بھی کر لیں گے۔ جب آپ کا بیٹا بڑا ہو جائے گا تو ہم اُسے وزیر بھی بنائیں گے۔“ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ میں کہیں بھی جانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ میں وہیں رہنا چاہتی ہوں جہاں میرے شوہر مجھے چھوڑ کر گئے ہیں۔ قبائلی سردار ذرا فیاضی کے موڈ میں تھا اس لیے میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن دیگر خواتین کے بارے تشویش کا اظہار کیا جو ابھی تک جیل میں تھیں۔ انہوں نے مجھے مطلع کیا کہ عورتوں کو جیل سے رہا کیا جا چکا ہے لیکن انہوں نے اسی شہر میں رہنے کی درخواست کی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ کافی نہیں۔ انہیں دوبارہ آباد کیا جانا چاہیے۔ وہ اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہیں تھیں۔ کئی گھرباہ ہو چکے تھے۔ میں نے خان سے کہا کہ وہ مجھے اجازت دیں کہ میں خود جا کر ان محتاجوں کی دیکھ بھال کر سکوں۔ اس حل میں شاید ایک عنصر قرارت کا بھی تھا لیکن اُس وقت میری سوچ بہر حال یہی تھی کہ شاید میں ان سیکڑوں بدنصیب لوگوں کے لیے کچھ کر سکوں گی۔ خان یہ بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے بجائے اُس نے مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ واپسی پر وہ دونوں چیف باورچی خانے کے پاس سے گزرے اور باورچیوں کو حکم دیا کہ جب تک ہم لوگ اس گھر میں موجود ہیں تو یہاں بڑا گوشت ہر گز نہ پکایا جائے۔

مسز مودی کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی اور اُس کا زخم فوری توجہ کا محتاج تھا۔ میں نے ایک سپاہی کو ڈاکٹر لانے کے لیے بھیجا لیکن اُسے دو کشمیری کپاؤنڈرزل سکے جنہوں نے بمشکل مسز مودی اور کملا کے زخموں کی ڈریسنگ کر دی۔

میرے سابق میزبان، جسے میں نے کچھ روز قبل منہ بولا بھائی بنا ڈالا تھا، کو جب معلوم ہوا کہ میں بنگلے میں واپس آ گئی ہوں تو وہ اپنے باپ کے ہمراہ مجھے ملنے کے لیے آیا۔ وہ ہمیں مصیبت سے محفوظ دیکھ کر بہت

خوش ہوئے۔ میرے سابق مہربان نے کہا۔ ”آپ واقعی بہت خوش نصیب ہیں۔ آپ کو یاد ہے جس روز آپ ہمارے ہاں تھیں تو حملہ آوروں نے ہمارے گھر کی تلاشی لی اور میری بیوی کے زیورات اور سارے کپڑے لے کر چلے گئے۔ آپ کے زیورات کو انہوں نے چھو اتک نہیں۔ میں نے بڑی احتیاط سے اُس کی حفاظت کی ہے اور کل آپ کو لا کر دے دوں گا۔“

”بہت مہربانی۔ لیکن وہ میرے لیے نہ لائیں اپنے لئے رکھ لیں۔“

”نہیں، میں آپ سے نہیں لوں گا۔ کسی بھی وقت وہ آپ کے بچوں کے کام آئے گا۔“ جانے سے پہلے اُس نے پھر وعدہ کیا کہ وہ اگلے روز زیورات لے کر آجائے گا۔

سُریش نے خان کے آدمیوں سے دوستی کر لی تھی اور اکثر اُن کے ساتھ باہر بھی چلا جاتا تھا۔

ایک روز وہ واپس گھر آیا اور مجھ سے کہا۔ ”ماں! میرا قبیلہ (Caste) کون سا ہے؟“

”بیٹے کیا تم یہ نہیں جانتے، ہم ویش مہاجن ہیں۔“

”ہاں، یہی میں نے بھی اُن کو بتایا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور اُن میں سے ایک کا خیال تھا کہ یہ مہاجن کوئی بہادر لوگ ہیں کیونکہ میرے باپ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُن کی گولیوں کا سامنا کیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں بھی اُسی طرح بہادر بنوں گا۔ آپ کو یاد ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ہمیں بتایا تھا کہ راجپوت سب سے بہادر نسل ہے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”راجپوت واقعی بہت بہادر ہوتے ہیں۔ لیکن بہت سے دوسرے لوگ بھی ہیں جنہوں نے ایسے ایسے کام کیے ہیں جن کے لیے بے پناہ جرات کی ضرورت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ میری گفتگو کے دوران سُریش سرگرم آنکھوں سے گھور رہا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”کیوں سُریش! معاملہ کیا ہے؟“

”ماں! مجھے اپنی آنکھوں میں جھانکنے دیں، خان کا بھائی کہتا تھا کہ آپ کوئی معمولی خاتون نہیں ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کی آنکھوں میں آگ ہے اور وہ اُن میں نہیں دیکھ سکا۔ لیکن مجھے تو کوئی آگ نظر نہیں آئی۔“

مجھے معلوم تھا کہ سُریش پریشان ہے۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میری آنکھوں میں کچھ نہیں ہے۔ سُریش! حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ میرے چہرے پر نگاہیں ڈالتے ہوئے اس لیے ڈرتے ہیں کیونکہ اس طرح انہیں اپنی غلطیاں اور زیادتیاں یاد آ جاتی ہیں۔ حالانکہ میری آنکھیں ویسی ہی ہیں جیسی دوسرے بے



شمار لوگوں کی۔“

قبل اس کے کہ میں اپنی بات ختم کرتی۔ تین آدمی دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور تینوں نے بیک زبان کہا۔ ”ماتا جی! وہ بارہ مولہ پہنچ چکے ہیں۔ لوگ آگے سے مزاحمت کر رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ ایک یا دو دونوں میں سری نگر پہنچ چکے ہوں۔“ میں اس خبر پر یقین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے اُس کی تصدیق اس طرح کی کہ عین ممکن ہے یہ افواء ہو۔ اُن میں سے ایک میری بات پر ہنسا اور کہا۔ ”آپ کو اس قدر یقین کیوں ہے؟ آپ ایک دو دونوں میں خود دیکھ لیں گی کہ اس میں کتنی سچائی ہے۔“

اگلی مرتبہ دونوں قبائلی سردار دوبارہ مجھے ملنے آئے اُن کے ساتھ دو اور آفیسر بھی تھے۔ ان میں سے ایک پولیس کا کیپٹن (ASP) تھا جو میرے آبائی ضلع سے تعلق رکھتا تھا اور دوسرا رحم داد خان تھا جو ہزارہ ڈسٹرکٹ کے ایکسٹرا کمشنر کے طور پر معروف تھا۔ اُن دونوں نے مجھے سلام کیا اور رحم داد خان نے کہا۔ ”مجھے وزیر صاحب کے قتل کی خبر سن کر بہت دکھ ہوا ہے۔“

میرے پاس وہی جواب تھا جو میں پہلے بھی دے چکی تھی کہ ”ایک ہیرو (Hero) کی موت پر ماتم نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے ہمدردی کی اتنی ضرورت نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور جانا چاہوں گی کہ آپ ہمارے مردوں اور عورتوں کو اذیت کیوں دیتے ہیں؟“ میں نے اپنی گفتگو میں کیپٹن کو مخاطب کیا تھا جس نے پُر جوش انداز میں جواب دیا۔ ”اب جہازوں اور توپوں کے ساتھ مکمل جنگ ہوگی۔ ہم دنیا کو بتادیں گے کہ بہادر کیسے لڑتے ہیں۔“ رحم داد خان کا روئے نہایت دوستانہ تھا۔ ”میں نے آپ کے نڈر اور بے خوف بچوں کے بارے سنا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”خدا انہیں برکت دے۔ آپ نے بہت ہی جرأت اور صبر کا ثبوت دیا ہے۔ ہم آپ کو یہاں خوش رکھنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ یہاں کا نیا وزیر آپ کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔“

اُس کے دوستانہ روئے سے شہ پاکر میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ شہر کے حالات کو کنٹرول کریں اور اُن مشکلات اور مصائب کا ازالہ کریں جو حملہ آور لوگوں پر ڈھا رہے تھے۔ اُس نے تمام معاملات کو درست کر لینے کا وعدہ کیا۔

جب وہ جانے لگے تو پولیس کے کیپٹن نے پوچھا ”اس جگہ کے کیپٹن (ASP) کے ساتھ کیا ہوا؟“ وہ مظفر آباد کے پولیس آفیسر کے بارے پوچھ رہا تھا۔ ”اُس کی فیملی یہاں نہیں تھی۔“ میں نے لا پرواہی سے جواب دیا۔

”ہاں، میں حملے سے تین دن پہلے یہاں آیا تھا اور جو جو یہاں تھا اُن سب سے ملا تھا۔“ یہ کہتے

ہوئے وہ مسکرایا اور بدنیت نگاہوں کے ساتھ ”کامیابی“ کا تاثر دیا۔ یہ شخص جاسوس کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔ جس پولیس کیپٹن کا یہ ذکر کر رہا تھا وہ اُس وقت جب مہتاجی بنگلے سے نکلے تو اُن کے ساتھ تھا۔ لیکن بعد میں اُس نے ایک قریبی گھر میں پناہ لے لی تھی۔ پاکستانی اُسے تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے اُسے دو میل سے اُس وقت پکڑ لیا تھا جب وہ پینے کا پانی لینے کے لیے باہر آیا۔ اس کے بعد اُسے گولی مار دی گئی تھی۔ سابقہ انتظامیہ کے بے شمار آفیسرز قتل کر دیئے گئے تھے۔ لیکن حملہ آوروں کو یہ ہدایات تھیں کہ وہ کشمیری پنڈتوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں۔ دن گزرتے رہے اور ہم اب تک اُسی بنگلے میں تھے۔ ماحول تجسس اور شکوک و شبہات کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ کسی پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں مسلسل اپنے شوہر کے بارے سوچتی رہی اور بچوں کو بتاتی رہی۔ ”کتنی اچھی بات ہوتی کہ ہمارے پاس تمہارے باپ کی کوئی تصویر ہوتی۔“ ایک گھنٹہ بعد سریش دوڑتا ہوا آیا اور اُس کے ہاتھ میں باپ کی ایک تصویر اور اُس کا نیکیو بھی تھا۔

”یہ تمہیں کہاں سے مل گئی؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔

”ماں! میں ایک جگہ گھوم رہا تھا جب جھاڑیوں میں کوئی چیز نظر آئی جس نے میری نگاہوں کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ میں تجسس ہو گیا اُسے اٹھایا اور دیکھا کہ یہ پاپا کی تصویر تھی۔“ یہ انتہائی حیران کن بات تھی۔ قبائلی رحم داد خان کی وجہ سے ہمارے ساتھ مسلسل احترام کا برتاؤ کرتے رہے کیونکہ وہ خود بھی ہم پر کافی مہربان تھا۔ ہمارے راشن کی کمی پوری کرنے کے لیے اُس نے ہمارے لیے کچھ آٹا، گھی، دال اور چائے بھیجی۔ دوسرے آفیسر بھی ہمیں ملنے کے لیے آئے۔ اُن میں سے ایک نیا وزیر بھی تھا جو محکمہ مال کا سابق تحصیل دار تھا۔ محکمہ مال کا آفیسر اور تحصیلدار دونوں کشمیری مسلمان تھے۔ قبل اس کے کہ وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہم نے چند تکلفات کا تبادلہ کیا کیونکہ انہوں نے یہ فیصلہ اچانک کیا تھا۔ ”آپ جانتی ہیں کہ ہم جہنم میں رہ رہے ہیں؟ ہم اس زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔“

نئے بندوبست میں آفیسر ہونا کوئی مذاق نہیں تھا۔ میں نے اُن کی حوصلہ افزائی کی۔ ”اب آپ کو اس قدر مایوس بھی نہیں ہونا چاہیے۔ آپ اپنے فرض کو پہچانیں اور اُسے ادا کریں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے بھی حالات اچھے نہیں ہیں۔ یہاں میں اپنی بیٹیوں کے ہمراہ ان لوگوں میں رہ رہی ہوں اور ان کے رحم و کرم پر ہوں۔ حالات کو اپنا راستہ خود بنانے دیں؟“

”لیکن وہ آپ کی بہت عزت کرتے ہیں اور رحم داد خان یہ بات یقینی بنانا چاہتا ہے کہ آپ کو کسی قسم کا

رحم داد خان فی الواقعی بہت مہربان تھا۔ اُس نے فوری طور پر مسز سودی کا طبی معائنہ کرنے اور اُس کے زخموں پر مرہم پٹی کرنے کے لیے ایک ڈاکٹر اور کپاؤنڈر بھیج دیا۔

حالات کے پیش نظر میرے بچے بھی ٹھیک ہی جا رہے تھے۔ صرف میرا چھوٹا بچہ صبح سویرے اٹھنے کے بعد کچھ نہ کچھ کھانے پر اصرار کرتا تھا۔ میں اُسے شام کے کھانے سے بچ جانے والی روٹی دے دیا کرتی تھی۔ ایک دن اس معاملے میں معمول سے زیادہ شدت پیدا ہو گئی، جب اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور اُس کے گالوں سے نیچے بہنے لگے تو اُس نے کہا۔ ”ماں! میں یہ روٹی نہیں کھا سکتا۔ یہ میرے گلے میں چپک کر اٹک جاتی ہے۔ میں اسے نگل نہیں سکتا۔“

”میں جانتی ہوں، میرے بیٹے! لیکن کیا تم بہادر نہیں بنو گے، اگر تم یہ روٹی نہیں کھا سکتے تو تم اپنے ملک کے لیے کیسے لڑو گے؟ تم جانتے ہو کہ آج ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں ایسے بھی ہیں جنہیں یہ روٹی بھی میسر نہیں۔“

اُس نے اپنے آنسو صاف کیے اور جلدی سے روٹی کا وہ ٹکڑا جو اُس کے ہاتھ میں تھا، نگل لیا۔ چار روز کے بعد وہ میرے پاس آیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ماں! تمہیں پتا ہے کہ اس روٹی کا ذائقہ سکٹ کی طرح ہے۔“ چند روز کے بعد وہ میل بیمار پڑ گیا اور میرے پاس پیسے بالکل ہی نہیں تھے کہ میں اُس کے لیے دوا یا دودھ خرید سکتی۔ میں رحم داد خان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی جو اتفاق سے ہمارے گھر کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس نے رضا کارانہ طور پر مجھے دس روپے پیش کیے کہ میں انہیں ویمل کی بیماری پر خرچ کروں۔ لیکن مجھے دوسروں سے اُس طرح روپے مانگتے ہوئے اور لیتے ہوئے سبکی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے اندازہ ہو گیا کہ میرے دل میں کیا ہے۔ اس لیے اُس نے کہا۔ ”بہن جی! یہ روپے قبول کرنے میں آپ کو جو مشکل درپیش ہے، میں سمجھتا ہوں لیکن کیا ہمیں اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ڈھالنا نہیں چاہیے؟ کیا آپ اپنے لوگوں کی مدد بھی قبول نہیں کریں گی؟ کیا آپ مجھے اپنوں میں شمار نہیں کرتیں؟“

اُس نے پیسے ویمل کے حوالے کیے اور کہا کہ وہ بارہ مولہ کی طرف جا رہا ہے اور وعدہ کیا کہ وہ واپسی پر ہمارے لیے بہتر انتظامات کرے گا۔

اُس وقت بارہ مولہ میں شدید لڑائی ہو رہی تھی۔ قبائلیوں نے ہمارے گھر کا باورچی خانہ بند کر دیا تھا اور اُن کے دونوں سردار بھی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ قبائلی خود بھی کئی روز سے ادھر نہیں آ رہے تھے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ دوسرے سپاہیوں نے جنہیں پیچھے چھوڑا گیا تھا، اُن ہندوؤں کے گھروں کو

جنہیں جیل سے رہا ہونے کے بعد دوبارہ آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی تھی، لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ اُس وقت تک مقامی مسلمانوں کو بھی شاید پاکستان کی چال سمجھ میں آگئی تھی اور وہ خوفزدہ ہونا شروع ہو گئے تھے اور عجیب بات تو یہ تھی کہ اب وہ ہندوؤں سے مدد حاصل کرنے کی توقع کرنے لگے تھے اور اگر ہندو کسی مشکل میں ہوں تو اُن کی مدد کرنے کے لیے بھی آمادہ تھے۔

تاہم اس جذبے کے پیچھے وہ تازہ دم ناخوش گوار اطلاعات تھیں۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانی فوج قریب پہنچ چکی ہے۔

ایک دن چمن لال مجھے ملنے کے لیے آیا اور مشورہ دیا کہ میں اُس کے گھر منتقل ہو جاؤں۔ ”آپ سب کا اکیلے اس گھر میں رہنا کسی طرح بھی محفوظ نہیں ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ حملہ آور پسپا ہو رہے ہیں اور یقینی بات ہے کہ پسپا ہوتے ہوئے وہ مزید لوٹ مار کریں گے۔“ میں اس لحاظ سے خوش نصیب واقع ہوئی تھی کہ کئی دوست ہمیشہ میری مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں یقیناً اس مشورے پر غور و خوض کروں گی اور دو یا تین دنوں تک اُسے مطلع کر دوں گی۔





## ایک اور شریف النفس

ہمیں اپنے بنگلے میں واپس آئے کوئی دو ہفتے ہو چکے تھے۔ ہر طرف بے حس و حرکت سی خاموشی تھی جیسے وقت کی باگیں رک گئی ہوں۔ آتے جاتے لوگوں کی نگاہیں مسلسل گھورتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کی بصیرت ناقابلِ تلافی حد تک مستقبل سے ہٹ کر حال پر مرکوز ہو گئی تھی کیونکہ ماضی کے دامن میں اُن کے لیے کسی قسم کی کوئی تشفی نہیں رہ گئی تھی۔

بالآخر ہندوستان کے لڑاکا جیٹ طیارے افق پر نمودار ہونے لگے۔ تانے کی مانند نیلے آسمان کے پس منظر میں وہ یوں نظر آتے تھے جیسے سیاہ رنگ کے کئی مریضانہ زرد دھبوں والے پرندے ایک ساتھ اڑ رہے ہوں۔ اب یہ بات سچ ثابت ہو رہی تھی کہ ہندوستان کی فوج منظر پر متحرک ہو چکی ہے۔ ہم دو میل میں بم پھٹنے کی آوازیں سننے لگے تھے۔ کبھی کبھی روشنی کی سُرخ اور نیلی چمک کے بعد ایسی گرج دار آواز سنائی دیتی جیسے زوردار کھانسی۔ پھر کالے بادلوں کا دھواں آسمان کی طرف بلند ہو جاتا۔ جس سے ہمیں یقین ہونے لگتا کہ اس شور سے ہماری چھت زمین بوس ہو جائے گی۔ قبائلیوں پر ایسا خوف طاری تھا جس میں یک گونہ تقدس کی آمیزش بھی معلوم ہوتی تھی اور وہ ان جہازوں کو ”خدا کا بیٹا“ کہتے تھے اور اُن سے بہت خوفزدہ تھے۔ اب مقامی مسلمان بھی کھلم کھلا ان ہندوؤں کا ساتھ دینے لگے جن کے گھروں میں قبائلی عورتوں کو اغواء کرنے کی غرض سے داخل ہوتے تھے۔ کئی مسلمانوں نے علی الاعلان شہر میں قتل عام کی مذمت کی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسلامی عقیدے کو خطرے کے حوالے سے لوگ دودلی کا شکار تھے۔ غلط اور صحیح کے بارے مقامی تھوڑی سی عملیت میں ڈھلنا شروع ہو گئے اور مقامی مسلمانوں کے روئے راستی کی طرف گامزن ہونے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کا اور ہندوؤں کا مقدہ ایک ہے۔

مسز مودی بہت فکر مند تھی اور بیٹیوں کے ساتھ بنگلے میں رہنے کی وجہ سے مجھے حد درجہ بے وقوف سمجھتی

تھی۔ مجھے بھی احساس ہونے لگا کہ میں ایک خطرہ مول لے رہی ہوں اس لیے میں نے چن لال کے گھر میں منتقل ہونے کی تجویز سے اتفاق کر لیا۔ ابھی جب ہم دوسرے گھر میں منتقل ہونے کے لیے تیاریوں میں مصروف تھے تو اوم اور شیوا دیال سامان لے کر آگے چلے گئے۔ پولیس کانسٹیبل نے انہیں راستے میں روک کر پوچھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔

”ماتا جی نے ایک دوسرے گھر میں منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ بنگلے میں زیادہ دیر رہائش رکھنا غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔“

”نہیں، واپس جاؤ اور جا کر ماتا جی سے کہو کہ ہم انہیں کسی دوسرے گھر میں منتقل نہیں ہونے دیں گے۔ ہم اُن کی حفاظت کے خود ذمہ دار ہیں۔ میں رات کو گھر کی نگرانی کے لیے مزید پولیس بھیج دوں گا۔“

ملازم واپس آگئے لیکن اُس رات پولیس نہیں آئی۔ دوسری صبح ہم نے سنا کہ چن لال کا گھر لوٹ لیا گیا ہے اور کئی خواتین کو اغواء کر لیا گیا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اڑوس پڑوس کے گھر بھی تباہ و برباد کر دیئے گئے ہیں۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ میرا گھر اُن میں شامل نہیں تھا۔ میں اس سارے عرصے میں غیر معمولی طور پر خوش نصیب رہی ہوں اور عین وقت پر مصیبت سے بچ جاتی رہی ہوں۔

تقریباً چار روز کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہندوستانی فوج نے بارہ مولہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ قبائلیوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور وہ پسپا ہو رہے تھے۔ ہماری معلومات کے مطابق پاکستانی فوج کے آفیسر قبائلیوں کو مار مار کر لڑنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود لڑائی کے میدان سے بھاگ رہے تھے اور راستے میں مختلف دیہاتوں سے گزرتے ہوئے ہر طرح کی لوٹ مار میں مصروف تھے۔ پسپا ہوتے ہوئے مارے جانے والے کچھ حملہ آوروں کے سامان سے کٹے ہوئے انسانی اعضاء برآمد ہوئے جن کے ساتھ انگوٹھیاں اور کنگن وغیرہ تھے اور جنھیں جلدی کی وجہ سے وہ اتارنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اس لیے انہوں نے عورتوں کے بازوؤں اور ٹخنوں سمیت پاؤں کاٹ کر تھیلوں میں ٹھونس لیے تھے۔ ان واقعات نے مظفر آباد کے لوگوں کو رنج و غم کے علاوہ اذیت اور درد کے احساسات میں ڈبو رکھا تھا کیوں کہ انہوں نے زندگی میں اس طرح کے واقعات نہ دیکھے تھے نہ سنے تھے۔

ایک روز صبح سویرے چار بجے کے قریب ہمیں دل دوز چیخوں کی آواز سنائی دی۔ کسی کو انتہائی مشکل صورت حال کا سامنا تھا۔ عین اُسی وقت میں نے گھر کے باہر کسی کی آواز سنی، جو مجھے باہر بلا رہا تھا۔ میں نے باہر دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ ایک مولوی تھا جو ہمارے گھر کے قریب ہی ایک مسجد میں رہتا تھا۔ میں

اُس کو اچھی طرح نہیں جانتی تھی۔ مسز مودی کا خیال تھا کہ یہ کوئی دھوکہ ہو سکتا ہے لیکن میں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں باہر گئی تاکہ مولوی کی بات سن سکوں۔ اُس نے سوچا تھا کہ شاید ہمارے گھر سے کسی نے اُسے مدد کے لیے پکارا ہے۔ اس لیے وہ ادھر آ نکلا کہ شاید وہ کوئی مدد کر سکے۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ میرے لیے اس جنگلے میں رہنا محفوظ نہیں ہے، اُس کا خیال تھا کہ عین ممکن ہے، بلکہ اغلب ہے کہ حملہ آور اس گھر کی طرف آئیں گے اس لیے ہم سب یہاں کی بجائے اُس کے گھر میں زیادہ محفوظ رہیں گے۔

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اس تجویز سے اتفاق کر لیا کہ ہم اُس کے گھر میں منتقل ہو جائیں۔ لیکن مسز مودی اب بھی اُس کی نیت پر شک و شبہ کا اظہار کر رہی تھی۔ چونکہ وہ مولوی تھا اس لیے اس بات کا امکان موجود تھا کہ حملہ آور اُس کے گھر کی تلاشی نہیں لیں گے اور ہوا بھی یہی، جیسا کہ ہم نے سنا کہ اُس کے دوسرے روز حملہ آور ہمارے جنگلے میں داخل ہو گئے۔

بچوں نے مولوی کے گھر کو اچھی طرح چھان مارا۔ ایک کمرے میں انہیں کچھ فرنیچر ایسا ملا جو دراصل ہمارے گھر سے لایا گیا تھا۔ وہ یہ اطلاع دینے کے لیے دوڑ کر میرے پاس آئے۔ ”ماں! دیکھیں یہ سب ہماری چیزیں ہیں۔“

میں نے انہیں خاموش کیا اور کہا ”ارے! یہ کوئی بات نہیں۔ اگر یہ یہاں نہ لائی گئی ہوتیں تو یہ گھر کے ساتھ ہی جل چکی ہوتیں۔ یہ زیادہ اچھا ہے کہ کوئی انہیں استعمال کر رہا ہے۔“ ویسے بھی یہ وقت کسی طرح بھی موزوں نہیں تھا کہ اس بارے مولوی کے ساتھ بات کی جاتی۔

مسلمانوں میں بھی حواس باختگی کا عالم تھا۔ انہیں اطلاع ملی کہ ہندوستانی فوج کی ایک سکھر جمنٹ آگے بڑھ رہی ہے اور یہ بھی کہ جن مقامی مسلمانوں نے حملہ آوروں کا ساتھ دیا ہے انہیں بھاری سزائیں مل رہی ہیں۔ ایک رات کو تمام مقامی مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ شہر چھوڑ دیں گے۔ مولوی خود بھی بے آرامی کا شکار تھا اور اُس کی بیوی اپنی بیٹیوں کی وجہ سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وہ ایک لمبے عرصے سے اسی جگہ رہ رہی تھی اور اب اس زمین میں جڑیں پکڑ چکی تھی۔ اس کے لیے یہ مشکل ہو رہا تھا کہ وہ زندگی بھر کی یادوں اور روایات کو چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے۔

مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مجمع گھر کے باہر موجود تھا۔ عورتیں بین کر کر کے رو رہی تھیں۔ اور مرد مستقبل کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں جلدی جلدی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں اعتماد اور یقین کے ساتھ محسوس کر رہی تھی کہ ہندوستانی فوج کے خوف سے انہیں شہر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اُن میں سے چند ایک کو میں نے سوچنے اور

غور و فکر کرنے کی دعوت دی۔ ”مہربانی کر کے میری بات سنیں۔“ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ”آپ کو اتنی آسانی سے پاکستان کی پھیلائی ہوئی افواہوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ آپ میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

اُن میں سے ایک آدمی نے میری باتوں پر احتجاج کیا۔ اُس نے کہا۔ ”آپ نہیں جانتیں کہ جموں میں کیا ہوا ہے؟ ہندوستانی فوج کے سپاہی یہاں شہر میں جا بجا ہندوؤں کی بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہوں گے اور نہ ہی لٹے پٹے کھلے ہوئے دروازوں والے خالی گھروں کو دیکھ کر خوش ہو سکتے ہیں۔ بالآخر ہمیں ہی ان سارے واقعات کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔“

”میں جموں میں ہونے والے واقعات کے بارے کہانی کے ایک لفظ کو بھی درست نہیں سمجھتی۔ جو بھی ہو آپ کو یہاں سے بھاگنا نہیں چاہیے۔ اور میں آپ کے ساتھ یہ وعدہ کرتی ہوں کہ اگر کسی ایک نے بھی مرنا ہے تو سب سے پہلے میں مروں گی۔ میں آپ سب کو لے کر دو میل جاؤں گی اور آپ سے آگے آگے مارچ کروں گی اور سب سے پہلی گولی کا نشانہ بنوں گی۔ ویسے بھی ہندوستانی فوج کے آفیسروں سے ڈائیلاگ کرنا ان حملہ آوروں کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہوگا۔“

اس سے اُن میں قدرے حوصلہ پیدا ہوا اور اب میرے لیے انہیں قائل کرنا آسان ہو رہا تھا کیوں کہ وہ بھی تو فوری طور پر اپنا گھر بار چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ سب میرے ارد گرد جمع ہو گئے اور اُن میں سے ایک نے کہا۔ ”آپ اُن لوگوں کو جانتی ہیں جو حملہ آوروں کے پاس چلے گئے تھے۔ اس لیے آپ کو ہماری بے گناہی ثابت کرنا ہوگی۔ ہم تو حملہ آوروں کو یہاں نہیں لانا چاہتے تھے اور نہ ہی انہیں یہاں دیکھنا چاہتے تھے کیوں کہ ہندو اور مسلمان تو اس شہر میں اچھی طرح زندگی گزار رہے تھے۔“

اُن میں سے کچھ ایسے تھے جو شہر میں ٹھہر جانے کو عقل مندی کے خلاف سمجھتے تھے لیکن کچھ دوسرے اس کے برعکس سوچتے تھے اور اس بارے دو آراء موجود تھیں۔ اُن سب نے فیصلہ کیا کہ وہ عبدالعزیز کے گھر جا کر اُس سے مشورہ کریں گے۔

عزیز ایک درزی تھا اور شروع دن سے کشمیر نیشنل کانفرنس کا ممبر تھا۔ وہ ہر مقامی تحریک میں اگلی صفوں میں ہوتا تھا، جو سیاسی حقوق اور بہتر معیار زندگی کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ اُس نے ہر سادہ دل انسان کے دل میں جگہ بنا رکھی تھی۔ حملہ آوروں کے آنے سے کچھ ہی روز پہلے وہ جیل سے رہا ہوا تھا۔ اُس نے اتنی زیادہ مجبور محتاج ہندو خواتین کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی جتنی کہ اُس کے لیے ممکن تھا۔ محتاط اندازے کے مطابق



اس کے گھر میں چار سو سے زیادہ خواتین نے پناہ لے رکھی تھی کیونکہ اُس نے اپنے گھر کا سارا سامان باہر نکال لیا تھا۔

عزیز کا بھی یہی خیال تھا کہ مسلمانوں کو شہر چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اُس نے انہیں نصیحت کی کہ وہ متحد ہو کر مضبوطی سیکھڑے رہیں اور ہندوؤں کی مدد کریں۔ اُس نے اعلان بھی کر دیا کہ اُسے مجھ پر پورا بھروسہ ہے کہ میں اپنا وعدہ پورا کروں گی۔ اُس نے مجھے پیغام بھی بھیجا کہ وہ مجھے خوشی سے اپنے گھر میں پناہ دے دے گا۔

حملہ آور عزیز سے خوش نہیں تھے اور انہوں نے اُسے بے شمار دھمکیاں دے رکھی تھیں، بلکہ اُس کا گھر بھی لوٹ لیا تھا۔ اس کے باوجود اُس نے اپنی قابل قدر سرگرمیاں جاری رکھیں اور گرفتار ہو گیا۔ بعد میں ہمیں اطلاع ملی کہ اُسے گولی مار دی گئی تھی۔



## ایک اور وزیر کی زوال پذیری

ابھی تک مولوی اپنی مذہبی حیثیت کی وجہ سے اپنے آپ کو مذہب کے جھنڈے تلے محفوظ سمجھ رہا تھا۔ اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ اگرچہ حملہ آور نہ تو عورت کا احترام کرتے ہیں اور نہ ہی مال و منال کا، لیکن وہ ہیں تو اُسی مذہب کے پیرو جس کا وہ ترجمان تھا اس لیے وہ یقینی طور پر اُسے نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ لیکن اب اُسے کسی طرح یہ یقین ہونے لگا کہ وہ اُسے زیادہ دیر تک مفر نہیں رہنے دیں گے۔ انجانا سا خوف اُس کے روایتی توازن کو درہم برہم کرنے لگا اور اُسے معمول کی سنجیدگی اور مرتبہ نہ گفتگو سے محروم کرنے لگا۔ اُس نے اپنے لکڑی کے دروازے کے تختوں میں کیلیں گاڑھ دیں اور رائفل لوڈ کر کے قریب رکھ لی۔

دوسرے مسلمان بھی خوف زدہ تھے اور اس جذبے سے قرآن کی تلاوت کرتے تھے جو فطری بھی تھا اور خوف کی پیداوار بھی۔ ایسا کرنے سے وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ ”حملہ آور بہر حال مسلمان تھے اور یقیناً قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے لوگوں کو تکلیف نہیں دیں گے۔“ ان کا خیال تھا۔ لیکن یہ اُن کی خام خیالی تھی۔ کیوں کہ ایک مرتبہ وہ ایک کشمیری کے گھر میں داخل ہوئے جو بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔

”ہم سب مسلمان ہیں۔“ اُس نے حملہ آوروں سے مکالمہ کرنے کی کوشش کی اور کاہنے لگا۔ ”کیا آپ دیکھتے نہیں کہ میں قرآن مجید پڑھ رہا ہوں؟ بھائیو! آپ کو چاہیے کہ مجھے اکیلا چھوڑ دیں؟“

حملہ آوروں نے اپنے عزائم کے بارے اُسے کسی شک و شبہ میں نہیں رہنے دیا اور جواب دیا۔ ”ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ تم کیا پڑھ رہے ہو۔ ہم تو جس خدا کی عزت و احترام کرتے ہیں اُس کا نام پیسہ ہے۔“

انہوں نے اُس کے گھر کی ہر چیز لوٹ لی۔ حتیٰ کہ قرآن کو بھی پھاڑ دیا اور اُس کے اوراق کو فرش پر بکھیر دیا۔ اس حادثہ کی خبریں ارد گرد پھیل گئیں۔ پاکستانی یہ افسانہ برقرار رکھنے کے لیے کہ حملہ آور کافروں کے خلاف محض جہاد کی غرض سے آئے ہیں۔ وہ روزانہ مسجدوں میں قرآن خوانی کا اہتمام بھی کرتے تھے۔

نیا وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) پنڈت تارا چند اکثر ہمیں ملنے آیا کرتا تھا لیکن اُس نے کبھی اپنے

مصائب کا ذکر ہم سے نہیں کیا۔ میں البتہ اُس کی تھکی ہوئی آنکھوں اور منتشر چہرے سے اندازہ کر سکتی تھی کہ اُس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ حملہ آوروں کے ساتھ ٹھیک طرح سے نہیں چل رہا۔ چند روز کے بعد ہم نے سنا کہ وہ اعتماد کھو چکا ہے اور اپنا عہدہ بھی۔ اُس کے پاس رہنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اس لیے اُس نے ایک مسلمان درزی کے گھر میں پناہ لی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ اُس میں زندہ رہنے کے لیے مطلوبہ قوتِ ارادی ختم ہو چکی ہے اور جلد ہی اُسی گھر میں انتقال کر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اُسے دفن کر دیا۔ اُس کے بچے، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بعد میں ہلالِ احمر (ریڈ کراس) کے ذریعے دوسرے مہاجرین کے ساتھ مہاجر کیمپوں میں پہنچا دیے گئے۔

ہمیں مولوی کے گھر میں دس روز ہو چکے تھے اور ہمارا راشن بھی تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ مولوی چونکہ یہ راز فاش نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ہم اُس کے گھر میں رہ رہے ہیں، اس لیے ہمارے لیے راشن کا انتظام کرنے کے لیے بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

بچوں کے کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا اس لیے وہ سردی سے کانپتے تھے۔ اُن کے پھٹے پرانے کپڑے انہیں گرم رکھنے کے لیے کافی نہیں تھے۔ ایسا ہوا کہ ایک روز انہوں نے کچھ لڑکوں اور لڑکیوں کو باہر کھیلنے ہوئے دیکھا۔ شیلانے فوراً دیکھ لیا کہ اُن میں سے کچھ وہ کپڑے پہنے ہوئے تھے جو کبھی ہمارے ہوا کرتے تھے۔ میرے بچے دوڑ کر اندر آئے اور بھولی ہوئی سانس کے ساتھ سب ایک دم بول پڑے۔

”ماں! وہ میرا فراق پہنے ہوئے ہے۔“

”اس نے میرا کوٹ پہن رکھا ہے۔“

”ماں! جا کر ہمارے کپڑے واپس لا دیں۔ ہم یہاں سردی سے کانپ رہے ہیں اور اُن لوگوں نے ہمارے کپڑوں کی نمائش لگا رکھی ہے۔“

میں نے انہیں پُر امن رکھنے کی کوشش کی اور وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ میرے لیے یہ مناسب نہیں ہوگا کہ میں خود جا کر ان بچوں سے جھگڑا کروں۔ میں نے انہیں بتایا۔ ”اُن کے لیے بھی یہ اچھا نہیں ہوگا کہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے آپ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ جاؤ اور جا کر اُن کے ساتھ اُسی طرح کھلو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔“

میرے بیٹوں اور بیٹیوں کو اچھی زندگی گزارنے کا موقع ملا تھا اور وہ دوسروں کو بھی اچھے لباس میں دیکھنے کے عادی تھے اور جو کپڑے کبھی اُن کے پاس ہوا کرتے تھے اب وہ ان دوسرے بچوں کے لیے کسی قیمتی

تھے سے کم نہیں تھے۔ عام حالات میں جنہیں قبول کرنا بھی اُن کے لیے مشکل تھا۔

اب کافی اندھیرا ہو چکا تھا اور ہم حسب معمول دروازہ بند کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی مسجد گیا ہوا تھا۔ کوئی آہنگی سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اور ہم نے دروازہ کھولنے سے قبل قدرے جھجک کا مظاہرہ کیا۔ ایک پاکستانی آفیسر تھا اور اُس کے ساتھ تین سپاہی۔ آفیسر نے پوچھا۔ ”کیا وزیرنی صاحبہ یہاں ہیں؟“ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کیوں مجھے ملنے آیا تھا اور میں یہ فیصلہ بھی نہیں کر پا رہی تھی کہ میں اُسے کیا بتاؤں۔ آخر میں مجھے یہی سوچھی کہ اُس سے ملنا میرے لیے محفوظ ہوگا لہذا میں آگے بڑھی۔

”میرے شوہر وزیر (ڈپٹی کمشنر) تھے۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔

آفیسر نے مجھے مودبانہ ”سیلوٹ“ کیا اور کہا۔ ”بہن جی! میں صبح سے مختلف گھروں میں آپ کو تلاش کرتا رہا ہوں۔ رحم داد خان نے یہ راشن آپ کے لیے بھیجا ہے کہ آپ کو کسی چیز کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ چند روز میں وہ خود بھی یہاں آجائے گا۔“ سپاہیوں نے کچھ آٹا، گڑ اور نمک ہمارے حوالے کیا اور چلے گئے۔

ظاہر ہے کہ مولوی نے بھی آرمی کے جوتوں کی دھک دھک، جو اُس کے گھر کی طرف آرہے تھے سُن لی ہوگی اس لیے وہ بھی مسجد سے بھاگ کر گھر آ گیا۔ یہ قیاس کر کے کہ شاید کوئی غلطی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے پاکستانی یہاں آگئے ہیں، وہ بہت گھبرا گیا۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ ان لوگوں کو رحم داد خان نے بھیجا تھا، اُس نے سکھ کی سانس لی اور چیختے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال تو یہ تھا کہ اس گھر میں کوئی آپ کو نہیں جانتا۔“

اس وقت تک مولوی میرے ساتھ نہایت ہمدردانہ سلوک کرتا رہا ہے۔ وہ کبھی کبھی مجھے طویل مذہبی بحثوں میں مصروف رکھتا تھا اور میں صبر و تحمل سے اُس کی بات سنتی رہتی تھی۔ لیکن اس کی بیوی شاید اس وجہ سے ہم سے جلتی تھی کہ پاکستانی ہمارے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ میں نے اُسے راشن میں سے حصہ دے کر ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اُس نے پھر بھی دشمنی کا رویہ جاری رکھا۔

مولوی کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ ایک دفعہ میں نے اُسے اپنی بیوی سے یہ کہتے ہوئے سنا۔ ”مہربانی سے ان لوگوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کریں۔ وہ ہمارے مہمان ہیں اور اس کے علاوہ تمام آفیسرز سے ان کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ ہم انہیں تنگ کرتے ہیں تو ہمیں کسی مصیبت کا سامنا ہوسکتا ہے۔“ ایک شام کو مجھے خبر موصول ہوئی کہ رحم داد خان آیا ہوا ہے۔ میں اُسے ملنے کے لیے فکر مند تھی لیکن ہمارے لیے گلیوں میں ٹکنا اب بھی غیر محفوظ تھا۔ اس کے باوجود میں وزیر کے گھر گئی، جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ رحم داد خان مجھے دیکھ کر حیران ہوا اور کہا۔ ”آپ نے یہ سب تکلیف کیوں کی ہے۔ میں نے بہر حال صبح سویرے



آپ سے ملنے کے لیے آنا ہی تھا۔“ اُس نے اگلی صبح میرے پاس آنے کا وعدہ کیا تا کہ مختلف معاملات پر بات کی جاسکے۔ سو میں نے راشن کے لیے جو اُس نے بھیجا تھا، اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس چلی آئی۔

دوسری صبح رحم داد خان کچھ اور لوگوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں مظفر آباد سے کہیں اور جانا پسند کروں گی۔ میں نے یہ جگہ نہ چھوڑنے کے سلسلہ میں اپنی منشاء کو نہیں چھپایا اور اُس نے بھی کہیں اور جانے پر اصرار نہ کیا۔ میں نے اُسے اُن واقعات کی ساری رُوداد بیان کی جو اُس کی غیر حاضری میں واقع ہوئے تھے کہ کس طرح خواتین کے ساتھ اب بھی بدسلوکی ہو رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ”اس میں کوئی شک نہیں کہ میں آپ کی قیدی ہوں اور مجھے کچھ بھی کہنے کا حق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں میں آپ کو یہ تاثر بھی نہیں دینا چاہتی کہ میں آپ کو اخلاقیات کا درس دے رہی ہوں، کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو آپ پہلے سے نہیں جانتے۔ انسانی مرضی اور رضا کسی قسم کے اخلاقی بندھن سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتی، جن پر ہم سب ایمان رکھتے ہیں۔ آپ کے لوگوں نے اپنے دین کے نام پر اُن تمام مسئلہ انسانی اقدار کو پامال کیا ہے جو ہم سب کا مشترکہ ورثہ ہیں۔ میری دیانتدارانہ رائے ہے کہ بالآخر اُن کے یہ حربے اُن کے اپنے حق میں بھی ناکام ہو جائیں گے۔ اُن کے ان اعمال کے ٹھوس نتائج بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔ اس کے علاوہ اس راہ پر چلتے ہوئے وہ خود بھی تحلیل ہو سکتے ہیں۔“ اُس نے مجھے تفصیلی جواب تو نہ دیا لیکن مجھے مطلع ضرور کیا کہ اُس نے خواتین کی حفاظت کا اہتمام کر لیا ہے۔ تاہم، جب میں نے اُس سے یہ اجازت لینے کی کوشش کی کہ مجھے اُن کی نگرانی کا کام تفویض کیا جائے تو اُس نے کہا۔ ”آپ یہ کام نہیں کر سکیں گی۔“

ایک ڈاکٹر کے علاوہ اُس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جو اُس روز گفتگو میں شریک نہیں ہوا۔ یہ آدمی کچھ دن بعد مجھے ملنے کے لیے آیا اور اپنے آپ کو خان کے نام سے متعارف کروایا اور کہا۔ ”میں ڈاکٹر کا دوست ہوں اور ہم سب آپ کے بنگلے میں رہتے ہیں۔ مجھے ایک کمرے سے تختے کے نیچے کچلی ہوئی چند ہڈیاں ملی ہیں مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کے شوہر کی لاش اس کمرے میں جلی ہے۔ کیا آپ انہیں دریا میں بہانا پسند کریں گی؟“ میں نے فوراً اس تجویز کو مان لیا اور کہا۔ ”ہاں میں ایسا کرنا بالکل پسند کروں گی لیکن دریا پر کون جائے گا؟“ اُس نے پیش کش کی ”میں آپ کے ملازموں کے ساتھ کشن گنگا تک چلا جاؤں گا۔“

اسی اثنا میں مولوی کو معلوم ہو گیا کہ یہ اجنبی کون ہے۔ خان نے مولوی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”مولوی صاحب! کیا آپ اس خاتون کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے، جسے میں اپنی بہن سمجھتا ہوں؟ یاد رکھیے کہ اگر اسے کوئی نقصان پہنچا تو آپ کو جوابدہ ہونا پڑے گا۔“ پھر اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے

مسز مودی اب پہلے سے بہت بہتر تھی لیکن اُس کا زخم ابھی مکمل طور پر مندمل نہیں ہوا تھا۔ سابقہ ڈاکٹر اب نہیں آتا تھا اور نیا بھی ایک ہی مرتبہ رحم داد خان کے ساتھ آیا تھا۔ وہ ریاست کی فوج میں ڈاکٹر تھا اور اسلام قبول کرنے سے پہلے کشمیری پنڈت کہلاتا تھا۔ کچھ دن تک وہ روزانہ مسز مودی کے زخم کی ڈریسنگ کے لیے آتا رہا تھا۔ وہ مسکراتا نہیں تھا، لیکن اکثر آہ بھرتا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ ایسی گفتگو شروع ہو جائے جس کے دوران وہ کچھ وضاحت اور اپنے کیے کا جواز پیش کر سکے۔ یا شاید باہر کی دُنیا سے وہ بالکل لاعلم ہو چکا تھا جسے نہ تو ماضی کی یاد کو قبول کرنے کا حوصلہ تھا اور نہ ہی اسے اپنے شعور کا حصہ بنانے کا۔ اسی لیے وہ اس ساری حقیقت کو آہوں کے ذریعے خارج کر کے اطمینان حاصل کرتا تھا۔ مجھے کبھی اُس کے ساتھ زیادہ باتیں کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا اس لیے میں صحیح طور پر نہ سمجھ سکی کہ اُس کی پریشانی کا سبب کیا ہے۔

ڈاکٹر دس اور لوگوں کے ساتھ ہمارے بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ سب مولوی کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتے تھے اور اکثر اُسے ملنے اس کے گھر آتے رہتے تھے۔ وہ سب اُسی مسجد میں نماز ادا کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو پاکستانی اُس مسجد میں خطاب کرتے تھے جن میں ڈاکٹر اور اُس کے دوست بھی باقاعدگی سے آتے تھے۔ ڈاکٹر خان کے ساتھ اوڑی محاذ پر بھی گیا۔ انہوں نے آرٹھ کور کی گاڑیوں میں سفر کیا جنہیں ممکنہ ہوائی حملے سے بچانے کے لیے مٹیا لے، زیتونی اور سبز رنگ کا پینٹ کر کے سبز گھاس میں لپیٹا گیا تھا۔

ایک دن ڈاکٹر اپنے پانچ دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ مولوی کے گھر آیا اور میرے ساتھ ملاقات کا عندیہ ظاہر کیا۔ اُن میں پروفیسر مقبول قریشی بھی تھا جو سری نگر سے چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ وہ میرے شوہر کا کلاس فیلو تھا اور اس سے قبل وہ کئی بار ہمیں ملنے کے لیے آچکا تھا۔ میں ٹھیک نہیں تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ انہیں اندر بلا کر اُن سے ملاقات کروں۔ میں نے انہیں کہلا بھیجا کہ میں ٹھیک نہیں ہوں اس لیے اُن سے نہیں مل سکوں گی۔ لیکن انہوں نے ملے بغیر جانے سے انکار کر دیا۔ میں قدرے ناراض ہوئی اور گھر سے باہر آ گئی۔

”آپ مجھے آرام کیوں نہیں کرنے دیتے؟“ میں نے چیخ کر کہا

”میں نے آپ کو بتایا کہ میں ٹھیک نہیں ہوں۔ بہر حال اب آپ بتائیں کہ آپ کیا بات کرنا چاہتے

ہیں؟“

عام طور پر وہ مجھ سے میرے تجربات کے بارے جاننا چاہتے تھے لیکن اُس وقت میں اُن کے ساتھ کسی قسم کی تفصیلی گفتگو کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اُن میں سے ایک نے سریش کی طرف غور سے دیکھا اور مجھے ایک تجویز دی۔ ”مجھے بچارے اس لڑکے کا افسوس ہے جسے سکول بھی نہیں بھیجا جاسکتا۔ اگر آپ مجھے اجازت

دیں تو میں اس کی تعلیم کا خیال رکھوں۔“

”بہت شکریہ! لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ میرے بچوں پر رحم کھائیں۔“ میں نے بہت تلخی اور اختصار سے کام لیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ دوبارہ اُس وقت آئیں گے جب میں قدرے بہتر ہو جاؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ عورتوں کی تلاش میں تھے، جنہیں وہ اپنے ساتھ لے جاسکیں۔ اس مقصد کے لیے وہ گھر گھر گھومتے رہتے ہیں۔



# نجوی

ہم عملی طور پر صرف آٹے پر گزر بسر کر رہے تھے۔ میں دن میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتی تھی، پھر بھی مجھے پیش (Dysentery) کے حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے شیوا دیال کو بھیجا اور وہ ایک ڈاکٹر کو ساتھ لے کر آیا۔ یہ ڈاکٹر ایک جنوبی مسلمان تھا اور جب سے مظفر آباد میں آیا ہوا تھا اُس وقت سے مسلسل مقامی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی ناقابل یقین کہانیاں سناتا رہتا تھا۔ ایک روز جب میں صحن میں اُس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی، ہماری آوازیں قریب ہونے کی وجہ سے جہازوں کی گھن گرج میں ڈوب گئیں۔ میرے حملے کے اختتام کا انتظار کیے بغیر ہی ڈاکٹر نے بھاگ کر ایک درخت کے نیچے پناہ لے لی۔ وہ وہاں پریشان اور اُداس کھڑا تھا کہ میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”کیا آپ گھر کے اندر پناہ لینا مناسب نہیں سمجھتے تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو بھی جائے تو لوگ آپ کی دانش پر مہمشوروں کو یاد رکھ سکیں۔“ یوں لگا جیسے وہ میری طنز سے لطف اندوز نہیں ہو سکا۔ بعد ازاں مسجد میں کسی ہفتہ وار میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ ”مسز مہتا اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اُس نے مجھے چھپ جانے کو کہا، جبکہ ہم قبائلی لوگ کسی قسم کے خوف سے واقف نہیں ہیں۔“

عاشق حسین اور میاں ناصر دونوں کشمیری مسلمان تھے جو حملوں کے دوران ریاست کشمیر کے دار الحکومت سے بھاگے ہوئے تھے۔ عاشق اب وزیر (ڈپٹی کمشنر) بن گیا تھا اور میاں ناصر پولیس سپرنٹینڈنٹ۔ وہ مجھے ملنے آئے اور پوچھا کہ وہ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب میرا راشن ختم ہو جائے گا تو میں انہیں مطلع کر دوں گی۔ رحم داد خان جو ہم پر بہت مہربان تھا تبدیل ہو چکا تھا، مولوی کو بھی انتظامیہ میں کوئی عہدہ مل گیا تھا۔

اس دوران جو لوگ مجھے ملنے آئے اُن میں ایک معزز ستر سالہ پٹھان بھی تھا۔ وہ ایک نیک روح کا مالک نظر آتا تھا جو کئی سال تک الہ آباد میں رہ چکا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ قبائلیوں کا حملہ اسلام کے نام پر ایک



دعہ تھا۔ وہ پرانی یادوں کو کریدنے پر مائل تھا اور ماضی کے اچھے دنوں کے بارے بتا رہا تھا جب وہ دیگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ آنند بھون (Anand Bhowaun) گیا جہاں اُن سب کو مٹھائی پیش کی گئی تھی۔ ”ہم سب اچھے دوست تھے۔ لیکن دیکھیں کہ اب کیا ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کہ انسان کے اندر کی ساری خباثت کو باہر نکال دیا گیا ہے۔ غلیظ خواہشیں اور انتقام۔ یہ سب ان کے کسی کام نہیں آئیگا۔“ اس کے بعد وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

سردار ابراہیم پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کے سربراہ تھے اور جب وہ مظفر آباد آئے تو لوگ اُن کا خطاب سننے کے لیے مسجد میں جمع ہو گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ میں ایک مولوی کے گھر میں ہوں تو وہ مجھے ملنے کے لیے آئے۔ خان اور درانی بھی اُن کے ساتھ آئے۔ درانی جموں میں پلیڈر (وکیل) رہ چکا تھا اور میں اُسے اچھی طرح جانتی تھی کیونکہ اُس کی بہن میری دوست رہی تھی۔ جب میرے شوہر پونچھ میں گورنر کے عہدے پر تعینات ہوئے تھے تو سردار ابراہیم بھی وہاں وکالت کرتے تھے۔ میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اس سارے خون خرابے میں اُن کی بھی کوئی ذمہ داری ہو سکتی ہے۔ انہوں نے مہتاجی کے انتقال پر میرے ساتھ تعزیت کا اظہار کیا اور کہا کہ اُن تمام تکالیف کے لیے جن کا مجھے سامنا کرنا پڑا ہے، انہیں معاف کر دوں۔

میں جواب دیئے بغیر نہ رہ سکی۔ ”سردار صاحب! آپ مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہیں؟ سماجی اخلاقیات کے علاوہ یہاں اور بھی کئی موضوعات اور معاملات قابلِ غور ہیں۔ آپ کے لوگوں نے قتل و غارت اور لوٹ مار کی ہے ظلم و ستم اُن کی عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ جو اس قدر وسیع پیمانے پر زیادتیاں کرتے ہیں کہ بالآخر خود بھی نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ اس حد تک ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں کہ زندگی میں کبھی لاشعوری طور پر بھی ذہنی اذیت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ سماجی لحاظ سے بھی یہ لوگ کسی پر امن سماج کے لیے یقینی طور پر بے معنی ہو جاتے ہیں۔ سردار صاحب! آپ اپنی تاریخ سے واقف ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس کے اسباق سے بھی واقف ہوں گے۔“

انہوں نے کہا۔ ”ہم لوگوں پر ظلم و ستم نہیں کرتے۔“ میں دوبارہ بولنے والی تھی جب خان نے مداخلت کر کے مجھے چپ کرادیا اور کہا۔ ”ہم کسی بھی طرح کشمیر نہیں چھوڑیں گے۔“ اس جملے پر اُس کے اور سردار ابراہیم کے درمیان بحث چھڑ گئی لیکن میں یہ نہ سمجھ سکی کہ وہ کس بات کے حق میں اور کس کے خلاف دلائل دے رہے ہیں۔ جب اُن کی بحث ختم ہوئی۔ سردار صاحب نے کہا۔ ”میں ان خواتین کو جلد از جلد ہندوستان بھیجنا چاہتا ہوں بشرطیکہ وہ جانا چاہیں۔“

”کیا آپ کو کوئی شک ہے کہ ان کا انتخاب کیا ہوگا؟ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ان سب کی درخواستیں ابھی آپ کو پیش کر سکتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں، یہ اس طرح نہیں ہوگا۔ جب میں لاہور جاؤں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ میں وہاں سے ریڈیو پر اس کا اعلان کر سکوں گا۔ اس کے بعد آپ سب کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔“

انہوں نے اس کے بعد مولوی سے کہا۔ ”آپ نے ان خواتین اور بچوں کا خیال رکھ کر بہت اچھا کیا ہے۔“ انہوں نے مجھ سے پھر پوچھا کہ وہ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ خان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”ان کے بچوں کی طرف دیکھیں۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں جو انہیں گرم نہیں رکھ سکتے۔ آٹے کے علاوہ ان کے پاس کھانے کو اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا۔“ سب معاملات ٹھیک کرنے کا وعدہ کر کے سردار صاحب رخصت ہو گئے۔

ٹھیک چار دن کے بعد سردار صاحب نے کپڑوں کے چار جوڑے بھیجے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انہوں نے پرانے کپڑے بھیجے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی کپڑے لانے والوں نے راستے میں کی ہے کہ انہوں نے نئے کپڑے خود رکھ کر اپنے دوستوں کے پرانے کپڑے ہمیں دیئے۔ اس کے علاوہ ان کپڑوں کے ہمراہ کچھ صابن بھی تھا۔

ایک اور ملاقاتی ایک فارسٹ رینجر تھا جو میرے شوہر کو جانتا تھا۔ اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کشمیر چلی جاؤں۔ اُس نے بتایا۔ ”یہ آپ اور دیگر سب کے لیے جو جانا چاہتے ہیں بہت اچھا موقع ہے۔ دس لاریاں جو راولپنڈی سے ہمارے لیے غلہ لائی ہیں خالی واپس جا رہی ہیں۔ یہ آپ کو راولپنڈی تک لے جاسکتی ہیں اور وہاں سے آگے جموں جانا بہت آسان ہے۔“

”میں آپ کی تجویز پر غور کروں گی۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اس پر غور کریں اور مجھے ہسپتال میں مطلع کریں جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔“

ہم نے ایک مختصر میٹنگ کی اور فیصلہ کیا کہ ہم اس پیشکش کو قبول نہیں کریں گے۔ یہ اچھا فیصلہ تھا کیونکہ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ہم سب کو راستے میں قتل کر دینا چاہتا تھا۔

ہمیں مولوی کے گھر میں دو ماہ ہو چکے تھے۔ مولوی اور اُس کی بیوی دونوں ہی ہم سے تنگ آ چکے تھے لیکن انہیں خان اور دوسرے آفیسروں کا ڈر تھا جو انہیں کوئی سخت قدم اٹھانے سے روک لیتا تھا۔ مولوی اپنی ناپسندیدگی کو، بالخصوص چمن لال کے بارے، ہرگز نہیں چھپاتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ ”یہ آدمی بہت دھوکہ باز

ہے۔ کیونکہ وہ کانگریس کا ممبر ہے۔“ دراصل چمن لال ہی وہ آدمی تھا جو ہمیں ہندوستانی فوج کے بارے کچھ معلومات بہم پہنچا دیتا تھا۔

ایک دن ڈاکٹر کسی کو ساتھ لے آیا اور میرے ساتھ اُس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ۔ ”یہ بمبئی کا جیولر ہے۔ یہ پنڈت نہرو کو بھی جانتا ہے اور آپ کی مدد کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہے۔“ جیولر نے سریش کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”کیا یہ آپ کا بیٹا ہے؟ میں غیر شادی شدہ ہوں اور اس کو اپنا بیٹا بنانا پسند کروں گا۔“

میں نے کہا۔ ”میرے پاس اب صرف یہی بچے رہ گئے ہیں۔ میں ان میں سے کسی سے بھی جدا نہیں ہونا چاہتی۔“

ڈاکٹر کو گفتگو کا یہ انداز پسند نہیں تھا اس لیے اُسے ملامت کرنے لگا۔ جیولر نے بات سمجھ لی اور موضوع کو بدل لیا۔ اُس نے میرا نام پوچھا اور کہا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے مستقبل کے بارے پیشن گوئی کر سکتا ہوں۔“

”پیشن گوئی کرنے کے لیے آپ کے پاس ہے ہی کیا۔ مجھ پر سب کچھ پہلے ہی واضح ہے۔“ انتہائی پیغمبرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اُس نے کہا۔ ”یوں لگتا ہے آپ کے خوشی کے دن تولد چکے ہیں لیکن خوش و خرم زندگی گزارنا اب بھی آپ کے اختیار میں ہے۔ ایک کمزوری آپ کے راستے میں حائل ہے۔ آپ کسی پر اعتماد نہیں کرتیں۔ اگر آپ کسی دوست کی بات سنیں تو سب ٹھیک ہو جائیگا۔ بصورت دیگر آپ بد حالی کا شکار ہو کر اندھی ہو جائیں گی۔“

میں نے اُس کی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اُسے احساس ہو گیا کہ میرے مستقبل کے بارے پیشن گوئی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لہذا اُس نے پوچھا۔ ”کیا میں تنہائی میں آپ کے ساتھ بات کر سکتا ہوں؟ میں آپ کو کوئی خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔“ میں اُسے صحن کے ایک کنارے پر لے گئی۔ اگرچہ مسز مودی اور دیگر نہیں چاہتے تھے کہ میں تنہائی میں اُس کے ساتھ بات کروں۔

”میری بہن کا ایک بیٹا ہندوستان میں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ آئیں تاکہ اُسے آپ کے بدلے میں یہاں لاسکوں۔“

اس کے بعد اُس نے میرے سامنے چند اور ناقابلِ عمل تجاویز پیش کیں اور پھر بدتمیزی کرنے پر اتر آیا۔ میں یہ سارا وقت اس خود ساختہ پیغمبر کو دیکھتی رہی تھی جس کی پیشن گوئی کا خلاصہ یہ تھا۔ وہ دوست تھا اور اگر

میں اس کے ساتھ ہندوستان جانے پر تیار نہیں ہوں گی تو مجھے بُرے دن دیکھنے پڑیں گے۔ میں نے اُسے برملا ماننے کی کوشش کی۔ ”اپنا ایڈریس مجھے دے جائیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ ہندوستان پہنچ کر آپ کے بھانجے کو یہاں بھجوا دوں گی۔“

اُس نے اصرار کیا۔ ”آپ میرے ساتھ کیوں نہیں چلتیں۔ میں آپ کو سیدھا پنڈت جی کے پاس لے چلوں گا۔“

”میں آخری بار آپ سے کہتی ہوں کہ میرا آپ کے ساتھ جانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں۔ جب میں ہندوستان گئی تو پنڈت جی سے خود مل لوں گی۔“ میں نے حتمی طور پر اُسے بتا دیا۔ تب اُس نے اپنا ایڈریس مجھے دیا اور کہا کہ اگر مجھے کوئی ضرورت پڑے تو اُسے خط لکھ دوں۔ جیولر دہنی توازن کھونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اس وجہ سے ناراض تھا کہ اُس کے سارے منصوبے ناکام بنا دیئے گئے اور میں اُس کی چال کو سمجھ گئی۔ اُس کا لہجہ جو پہلے نرم اور قائل کرنے والا تھا واضح طور پر تبدیل ہو کر ناراضگی کا اظہار کرنے لگا اور کہا ”آپ نے میرے احساسات کو مجروح کیا ہے۔“ خوش قسمتی تھی کہ اُس نے بحث و تکرار اور جھگڑا شروع نہیں کیا کیوں کہ اُسے ایسا کرنے سے بھی کوئی نہیں روک سکتا تھا۔





## چمن لال کے گھر میں

اب تقریباً روزانہ ہی فوجی ہمارے بنگلے پر جو پہاڑی کے نیچے تھا آنے لگے، جو اندھیرا چھانے کے بعد اگلے محاذوں پر چلے جاتے تھے۔ ایک روز تقریباً رات کے دس بجے مولوی کی دونوں بیٹیوں نے وینا اور دوسری لڑکیوں سے کہا کہ موسیقی سننے کے لیے اُن کے ساتھ چلیں۔ ایک تنگ کمرے میں مسلسل قید رہنے سے انسان بالکل تنگ آ جاتا ہے۔ اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت تھم گیا ہے، جیسے وقت باسی ہو چکا ہے اور اس میں ماضی اور مستقبل کے واقعات کو ایک دوسرے سے جدا کر کے دیکھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ میری بیٹیاں بھی شدت سے چاہتی تھیں کہ کوئی موقع ملے جس کے ذریعے وہ اپنی ٹانگیں سیدھی کر لیں، اس لیے فوراً رضا مند ہو گئیں۔ مجھے اُس وقت یہ نہ سوچا کہ میں اُن سے پوچھ سکوں کہ موسیقی کہاں ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ دراصل کوئی تین سو فوجی ہمارے بنگلے کے قریب خیمہ زن تھے۔ وہ اگلے محاذوں پر جا رہے تھے اور اس سلسلہ میں رات کے کھانے کے بعد گانے وغیرہ گارہے تھے۔

لڑکیاں کچھ وقت تک تو باہر کی طرف دیوار سے لگ کر موسیقی سنتی رہیں اور بعد میں گھومنے کے لیے ایک نزدیکی کھیت کی طرف چلی گئیں۔ کچھ قبائلیوں کا وہاں سے گزر ہوا تو انہوں نے ”وینا“ کے گرد گھیرا ڈالنے کی کوشش کی تو اُس نے زور سے چلا کر کہا۔ ”دیکھو! قبائلی آرہے ہیں۔“ اس طرح وہ قبائلیوں کو دھوکہ دے کر گرتی پڑتی واپس گھر آ گئیں۔ مولوی کی چھوٹی بیٹی بھی اُن کے ساتھ واپس آ گئی لیکن بڑی کو ایک قبائلی نے دبوچ لیا۔ یہ لڑکی بھی آسانی سے بچ کر واپس آ سکتی تھی کیوں کہ اس کا گھر وہاں سے بہت قریب تھا۔ شاید فوری خوف نے اُسے مفلوج کر دیا جس کی وجہ سے اُس نے بچنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ”میں ایک مسلمان لڑکی ہوں، مجھے جانے دو۔“ اُس نے چلا کر کہا۔ اُس نے اپنے دعوے کے حق میں کلمہ بھی پڑھا لیکن شہوت پرست قبائلی مذہب کو بھی اپنی خواہش کی راہ میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ”تم ایک کافر کی بیٹی ہو۔“ انہوں نے اصرار

کیا۔ اسی اثنا میں اُس کا ایک بھائی اور چچا جو قریب ہی رہتے تھے موقعہ واردات پر پہنچ گئے۔ لیکن اُن کی منت سماجت بھی کسی کام نہ آئی اور لگتا تھا کہ قبائلی سپاہیوں نے اپنی خواہش کی تسکین کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ کسی نے دوڑ کر مسجد میں مولوی کو اطلاع دی جو لڑکھڑاتا ہوا دوڑ بھاگ کر کے مقام ابہام (موقعہ واردات) پر پہنچ گیا۔ اُس نے کہا۔ ”یہ میری بیٹی ہے اور میں پکا مسلمان ہوں۔“ اُس کی آواز پر سکون اور ہموار تھی لیکن دیکھنے والوں کے قریبی دائرے کے علاوہ کسی کو سنائی نہیں دی۔ اس وقت اُس کی آواز میں روایتی کھنک اور جارحانہ مذہب پرستی نہیں تھی۔ شاید اپنے قابلِ فخر عقیدے کو ایک معمولی سے ذاتی مقصد کے لیے استعمال کرنے سے اُس کی انا مجروح ہو رہی تھی۔ قبائلیوں نے لڑکی کو تو چھوڑ دیا لیکن واپس جاتے ہوئے آوارہ نگاہوں سے اور غیر تسکین شدہ خواہش اور کم ظرف شکست خوردگی کے عالم میں دیکھتے رہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مذہبی ہم آہنگی بھی خواہشوں کو کچلنے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ اس کیفیت نے خواہش کی تسکین کے لیے اُن کی گمراہ کن جذباتیت کو مزید پستی میں اتار دیا۔

جب لڑکی واپس گھر آئی تو اُس کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور چیخنے چلانے لگی جس کی وجہ سے اُس کی ناک بہنے لگی اور وہ اپنے شوہر کے خلاف مغلظات بکنے لگی۔ وہ اُسے ہر طرح سے لعنت ملامت کرتی تھی اور غراتے ہوئے کہتی تھی۔ ”تم نے ہی ہندوؤں کو اس گھر میں بسانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی لیے میری بیٹی کو آج یہ بُرا دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔“

مولوی کی بیوی کے لیے ہمارا وہاں ٹھہرنا ہمیشہ ہی سے ناگوار رہا ہے اور جب ایک مصیبت آئی تو وہ اپنے موقف کو کیش کر دینے پر تیار ہو گئی۔ مولوی اپنی نک چڑھی بیوی کی مداخلت سے بیزار تھا اور اُس کے سخت خلاف تھا کیوں کہ وہ اس وقت بے ضرر خود رنجی (Self pity) کے احساس سے محفوظ ہونے کی طرف مائل تھا۔ تاہم اس کے باوجود میں اپنے آپ کو اس کے سامنے قصور وار سمجھتی تھی۔ اس کے رنج و غم کا جواز بھی موجود تھا کیوں کہ اگر ہم وہاں نہ ہوتے تو شاید انہیں یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ میرے لیے اُس کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کرنا پریشان کن تھا اس لیے میں نے محتاط طریقے سے بات شروع کی۔ ”میں بہت خوش ہوں کہ آپ کی بیٹی واپس آ گئی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ہم لوگ آپ سب کے لیے مصیبت کا باعث بن رہے ہیں۔ میں ایک یادو دن میں اس گھر سے کہیں اور منتقل ہونے کا انتظام کر لوں گی۔“

میں نے خان کو پیغام بھیجا کہ میں اُسے ملنا چاہتی ہوں اور وہ پہنچ گیا۔ میں نے اُسے اس خواہش سے کہ میں مولوی کا گھر چھوڑنا چاہتی ہوں، آگاہ کیا۔ میں نے اس بارے وزیر (ڈپٹی کمشنر) سے بھی بات کی

لیکن اُن دونوں میں سے کسی نے بھی اس تجویز پر رضامندی کا اظہار نہ کیا۔ وہ مُقرر تھے کہ میں وہیں رہوں۔ لیکن اس کی کئی اور وجوہ بھی تھیں جن کے سبب میں زیادہ دیر وہاں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ مولوی ڈاکٹر کے ساتھ گھنٹوں تنہائی میں باتیں نہ کرتا ہو۔ مجھے ڈاکٹر پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں تھا اس لیے میں حیران تھی کہ مولوی ڈاکٹر سے کیا باتیں کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے مولوی کی خیر خواہی پر شک ہونے لگتا تھا۔

ایک روز پروفیسر مقبول مجھے ملنے کے لیے آیا۔ اب وہ نئی انتظامیہ میں آفیسر کے عہدے پر تعینات ہو چکا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”مسز مہتا! آپ کتنی خوش نصیب ہیں کہ ہمارے صدر ابراہیم آپ کی حمایت کے لیے آپ کے پاس آئے۔“

”اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟“ میں نے فوراً جواب دیا۔

”آپ اپنا مقابلہ ہندوستان میں اُن مسلمان عورتوں سے کریں جنہیں برہنہ کر کے جلوس نکلوایا گیا۔ آپ کے ساتھ کبھی ایسا سلوک تو نہیں ہوا۔“

میں دلیل بازی میں الجھنے کے لیے فکر مند اور بے قرار نہیں تھی۔ میرے پاس چونکہ کرنے کو کوئی کام نہیں تھا، اس لیے میں اکثر فارغ رہتی تھی اور اس طرح میں قدرے دروں بنی کا شکار ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے اُس کے ساتھ تفصیلی مکالمہ کیا۔ ”مجھے یہ سن کر بہت صدمہ پہنچا ہے کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہے اور اگر ہوئی ہے تو یہ شرم کی بات ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں اس کہانی پر یقین رکھتی ہوں کہ ننگی عورتوں کو بھرے بازار میں مارچ کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے تو میں اُن کے احساسات کو سمجھتی ہوں کہ انہوں نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ جب آپ خود دکھ درد کا شکار ہوں تو دوسروں پر اسی طرح آسانی سے رحم آتا ہے جس طرح اپنے آپ پر۔ جب دکھ درد کا موسم قربت اور ذاتی حیثیت اختیار کرتا ہے تو یہ جانا پہچانا سا بھی لگنے لگتا ہے اور پھر انسان اس کو اتنی آسانی سے سمجھ جاتا ہے جتنا اُس نے پہلے کبھی نہیں سمجھا ہوگا۔ جب آپ دوسروں کے مصائب پر عمومی (باہر سے ہو کر) نظر ڈالتے ہیں تو ہمدردی کے جذبات کم از کم جزوی طور پر ہی سہی جھوٹے ہوتے ہیں۔ صرف واردات میں قلب و روح کی بھرپور شمولیت کے باعث حساسیت کی نشوونما ہوتی ہے اور جذباتی ادراک اُسی وقت مکمل ہوتا ہے جب حساسیت تیز ہو جائے۔ اور اگر آپ ہمیں اُس قسم کے جلوس میں لے جانا چاہتے ہیں تو میں ذاتی طور پر زیادہ دکھ محسوس نہیں کروں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلسل دکھوں میں جسم اور روح مختلف طریقوں سے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ جسم پہلے پہل جھنجھری لیتے ہوئے اینٹھتا ہے لیکن بالآخر درد خود مزاحمت کو ختم کر دیتا ہے۔ ایک حد تک چلنے کے بعد روح جسم سے فاصلے پر ہو جاتی ہے اور اپنے آپ کو جسم

لیکن اُن دونوں میں سے کسی نے بھی اس تجویز پر رضامندی کا اظہار نہ کیا۔ وہ مُقرر تھے کہ میں وہیں رہوں۔ لیکن اس کی کئی اور وجوہ بھی تھیں جن کے سبب میں زیادہ دیر وہاں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ مولوی ڈاکٹر کے ساتھ گھنٹوں تنہائی میں باتیں نہ کرتا ہو۔ مجھے ڈاکٹر پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں تھا اس لیے میں حیران تھی کہ مولوی ڈاکٹر سے کیا باتیں کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے مولوی کی خیر خواہی پر شک ہونے لگتا تھا۔

ایک روز پروفیسر مقبول مجھے ملنے کے لیے آیا۔ اب وہ نئی انتظامیہ میں آفیسر کے عہدے پر تعینات ہو چکا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”مسز مہتا! آپ کتنی خوش نصیب ہیں کہ ہمارے صدر ابراہیم آپ کی حمایت کے لیے آپ کے پاس آئے۔“

”اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟“ میں نے فوراً جواب دیا۔

”آپ اپنا مقابلہ ہندوستان میں اُن مسلمان عورتوں سے کریں جنہیں برہنہ کر کے جلوس نکلوایا گیا۔ آپ کے ساتھ کبھی ایسا سلوک تو نہیں ہوا۔“

میں دلیل بازی میں اُلجھنے کے لیے فکر مند اور بے قرار نہیں تھی۔ میرے پاس چونکہ کرنے کو کوئی کام نہیں تھا، اس لیے میں اکثر فارغ رہتی تھی اور اس طرح میں قدرے دروں بنی کا شکار ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے اُس کے ساتھ تفصیلی مکالمہ کیا۔ ”مجھے یہ سُن کر بہت صدمہ پہنچا ہے کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہے اور اگر ہوئی ہے تو یہ شرم کی بات ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں اس کہانی پر یقین رکھتی ہوں کہ ننگی عورتوں کو بھرے بازار میں مارچ کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے تو میں اُن کے احساسات کو سمجھتی ہوں کہ انہوں نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ جب آپ خود دکھ درد کا شکار ہوں تو دوسروں پر اسی طرح آسانی سے رحم آتا ہے جس طرح اپنے آپ پر۔ جب دُکھ درد کا موسم قربت اور ذاتی حیثیت اختیار کرتا ہے تو یہ جانا پہچانا سا بھی لگنے لگتا ہے اور پھر انسان اس کو اتنی آسانی سے سمجھ جاتا ہے جتنا اُس نے پہلے کبھی نہیں سمجھا ہوگا۔ جب آپ دوسروں کے مصائب پر عمومی (باہر سے ہو کر) نظر ڈالتے ہیں تو ہمدردی کے جذبات کم از کم جزوی طور پر ہی سہی جھوٹے ہوتے ہیں۔ صرف واردات میں قلب و روح کی بھرپور شمولیت کے باعث حساسیت کی نشوونما ہوتی ہے اور جذباتی ادراک اُسی وقت مکمل ہوتا ہے جب حساسیت تیز ہو جائے۔ اور اگر آپ ہمیں اُس قسم کے جلوس میں لے جانا چاہتے ہیں تو میں ذاتی طور پر زیادہ دُکھ محسوس نہیں کروں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلسل دکھوں میں جسم اور روح مختلف طریقوں سے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ جسم پہلے پہل جھرجھری لیتے ہوئے اینٹھتا ہے لیکن بالآخر درد خود مزاحمت کو ختم کر دیتا ہے۔ ایک حد تک چلنے کے بعد روح جسم سے فاصلے پر ہو جاتی ہے اور اپنے آپ کو جسم

کے درد سے غذا فراہم کرنے لگتی ہے۔ اپنے آپ پر رحم کھانا اچھی بات ہے اگرچہ یہ خودترحمی اُس امن و سکون کا کوئی مناسب متبادل نہیں ہے جو صرف حقیقی اور جائز حرکت، سرگرمی اور عمل سے مل سکتا ہے۔“

پروفیسر نے میری باتیں صبر و ضبط سے سُنیں اور وہ اپنی خیر خواہی کا یقین دلانے کے بارے فکر مند رہا۔ ”براہ مہربانی میری بات کو دل میں جگہ نہ دیں۔ مجھے اس واقعہ کا ذکر کرنے پر افسوس ہے۔ آخر کار آپ کا بہت کچھ میری طرف واجب الادا ہے اور میں آپ کی مہربانی کیسے بھلا سکتا ہوں؟ آپ نے اُس وقت میری ماں کا خیال رکھا جب میں یہاں سے دُور تھا۔ وہ رات کس قدر خوفناک تھی؟“

”اوہ! جو کچھ میں نے کیا وہ ایک اچھا لیکن معمول کا برتاؤ تھا جو میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو ضرور کرتا۔ مہربانی فرما کر اس کا ذکر نہ کریں اس سے مجھے پریشانی ہوتی ہے۔“

ایک روز مولوی میرے پاس آیا اور تجویز پیش کی۔ ”میں آپ کو راولپنڈی بھیجنے کے انتظامات کر رہا ہوں۔ آپ وہاں اُس وقت تک آرام سے رہ سکتی ہیں جب تک سارے معاملات واضح نہیں ہو جاتے۔“

میں نے زور دے کر جواب دیا کہ۔ ”میں کہیں اور نہیں جاؤں گی۔ میں اُمید کرتی ہوں کہ میں بہت جلد چمن لال کے گھر منتقل ہو جاؤں گی۔“ ظاہر ہے کہ وہ واقعات کی اس طرح تبدیلی نہیں چاہتا تھا، اس لیے کچھ سوچتا ہوا واپس چلا گیا۔ خان نے مجھے نصیحت کی ہوئی تھی کہ اگر میں گھر تبدیل کروں تو اُسے مطلع کر دوں تاکہ وہ میری حفاظت کر سکے۔ تاہم میں اُسے اپنے منصوبے کے بارے بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اندھیرا زیادہ ہونے سے قبل میں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو چمن لال کے گھر بھیج دیا اور اُس کے فوراً بعد ہم سب بھی وہیں چلے گئے۔

اب ہمارے پاس ایک صاف ستھرا کمرہ تھا جو صرف ہمارا تھا۔ اگرچہ یہ کمرہ حملہ آوروں کے ہاتھوں لُٹ چکا تھا لیکن یہ جلنے سے بچ گیا تھا۔ سارے سامان میں سے جو کچھ بچ سکا تھا وہ چند ٹوٹے پھوٹے برتن تھے یا ایک دو رضائیاں۔ گھر میں دیگر لوگوں کے اوڑھنے کے لیے بور یوں کو سی کر بستر بنائے گئے تھے۔

چمن لال کو ایک بھاری کنبے کی کفالت کرنا تھی۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا اور اُس کی دو بہنیں تھیں۔ اُن میں سے ایک شادی شدہ تھی اور اُس کا شوہر اور بچے بھی چمن لال کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اُس نے کئی ہندو لڑکیوں کو بھی پناہ دے رکھی تھی جو دن کے وقت اُس کے تہ خانے کے سیلز (Cells) میں رہتی تھیں۔ صحن میں اُن محتاج کنبوں کے لیے خیمے لگا رکھے تھے جن کے لیے گھر میں رہنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ راتیں خوفناک حد تک سرد تھیں اور ان خیموں میں زندگی بے حد مشکل تھی۔

چمن کا گھر شہر کے وسط میں واقع تھا اور یہاں لوگوں کو مستقل خطرے کا سامنا تھا کہ حملہ آور بچے کچھے



سامان کو لوٹنے کی غرض سے کثرت سے اس علاقے میں گھومتے رہتے تھے۔ چمن کا والد نانک چند ایک نقل نویس تھا اور کسی وقت خاصا دولت مند بھی تھا۔ لیکن اب وہ ذلت آمیز غربت کا شکار تھا۔ چونکہ اُس کے سب کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے اس لیے مقامی مسلمان بھی وقتاً فوقتاً اُس کی مدد کر دیتے تھے۔ گھر میں حفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہیں تھا جس کی وجہ سے زندگی اور بھی مشکل ہو رہی تھی۔ ہم باہر جانے سے ڈرتے تھے اور جب کبھی رات کے وقت ہم ہمت کر کے باہر نکلتے تو جلے ہوئے گھروں کی تاریک شکلیں خوف کی حس میں مزید اضافہ کر دیتی تھیں اور ہم آگے پیچھے دیکھتے ہوئے چلتے جاتے تھے لیکن پھر بھی ہماری تھکی ہوئی آنکھیں منڈلاتے ہوئے دشمنوں کو تلاش کرتی رہتی تھی۔ رات کی ایسی دھمکی آمیز خاموشی میں ہمارے دل تیزی سے ڈھڑکتے تھے اور ہمارے کان گرج دار اعلانات سے بہرے ہونے لگتے تھے جو ایسے قریب الوقوع خطرے کے بارے ہو رہے ہوتے تھے جو کافی عرصے سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ خطرہ بذاتِ خود اپنا خوف ضائع کر چکا تھا لیکن سانس روک کر اُس ناگزیر آخری لمحے کا انتظار ہمیں تھکائے دے رہا تھا۔ ہم میں سے اکثر مقابلہ کرنے کی ہمت و جرأت سے محروم ہو چکے تھے۔ ہم کسی آخری اور قطعی لمحے کے منتظر تھے جو ہماری آزادی کا واحد ذریعہ بن سکتا تھا۔

وہ مہاجرین جو قتل عام (Holocaust) سے بچ گئے تھے ہر جگہ پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس جسم ڈھانپنے کو پٹے پرانے کپڑوں اور بور یوں کے ٹکڑوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ کچھ وقت کے بعد پاکستانیوں نے ہمیں تھوڑا تھوڑا راشن دینے کا فیصلہ کیا۔ خوشحال گھرانوں کے بچے پھیری (خوانچہ فروشی) کرتے ہوئے باہر جاتے تھے اور دو چار آنے کما لیتے تھے لیکن شہر کے مسلمان بمشکل ہی اُن سے کوئی چیز خریدتے تھے۔ اگرچہ کئی مسلمانوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ہندو بھی ہماری ریاست کے شہری ہیں اس لیے انہیں خوفزدہ نہ کیا جائے لیکن اس زبانی خیر خواہی کا کوئی ٹھوس عملی ثبوت دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہمارے گھر کے قریب ایک گوردوارہ تھا جس میں بہت سی وہ خواتین رہ رہی تھیں جن کے شوہر ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ کبھی کبھی قبائلی وہاں آتے اور اپنی پسند کی کسی بھی عورت کو اٹھا کر لے جاتے۔ اگرچہ وزیر (ڈپٹی کمشنر) نے اُن پر گارڈز مقرر کر رکھے تھے لیکن حملہ آور کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود کہ اب انتظامیہ معمول کے مطابق کام کرنے لگی تھی پھر بھی کسی قسم کے نظم و ضبط اور قانون کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔

دودن کے بعد خان مجھے ملنے کے لیے آیا۔ اُس نے کہا۔ ”میں نے سمجھا تھا کہ میں ہمیشہ آپ پر مہربان رہا ہوں لیکن شاید آپ کو میرے بارے بھی شک ہے۔ ورنہ آپ مجھے بتائے بغیر مولوی کا گھر تبدیل نہ کرتیں؟ لیکن پھر بھی میں آپ کی عزت کرتا ہوں جب تک میں یہاں ہوں تو آپ کے لیے جو کچھ کر سکا ضرور

کروں گا۔“

میں نے اپنے آپ کو قصور وار سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں، مجھے اس کا بہت افسوس ہے کہ مجھے گھر تبدیل کرنے سے قبل آپ کو مطلع کرنا چاہیے تھا۔“

میں نے فوری طور پر اپنا چاقو نکالا اور ایک انگلی کی لو میں چاقو چھو کر خون نکالا جس سے اُس کی پیشانی پر تلک کا نشان بنایا۔ اس کے بعد میں نے اُس کی ہتھیلی کے گرد ایک دھاگہ باندھا جو ”راکھی“ کی علامت تھی۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ میں نے اُسے منہ بولے بھائی کی حیثیت دے کر اُس کی یہ ذمہ داری شکریہ کے ساتھ قبول کر لی ہے، جو وہ میری حفاظت کے سلسلہ میں کر رہا تھا۔

یہ بات بے حد حیرت انگیز تھی کہ راکھی اور تلک اگرچہ ہندوانہ رواج تھے لیکن ہمیشہ ایسا ہوا کہ جب بھی یہ کسی مسلمان کو محبت کی علامت کے طور پر پیش کیے جاتے تو وہ بہر حال بہت شکر گزار ہوتا۔ وہ یہ محسوس کر کے کہ اُسے ایک ایسے رشتے میں تسلیم کیا گیا ہے جس کی ہندو ایک مذہبی اصطلاح کے طور پر جزوی طور پر ہی قدر کرتے ہیں۔

وہ بیٹھ گیا اور خواہش کا اظہار کیا کہ میں اُسے اپنے تجربات کے بارے کچھ بتاؤں۔ میں اُسے بتا رہی تھی کہ کس طرح میں نے پوری رضامندی کے ساتھ اپنے کانوں کی بالیاں اُتار کر ایک نگران پارٹی (Escort) کے حوالہ کیں۔ خان نے اصرار کیا کہ میں نے وہ کس کو دی تھیں کیوں کہ وہ قسم اٹھا رہا تھا کہ وہ اُس سے واپس لا کر دے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی اس لیے میں نے اُس کو کرائے کی نگران پارٹی کی شناخت کو بے نقاب کرنے سے انکار کر دیا۔

میرے انکار سے خان ناراض ہو گیا اور وہ یہ کہتے ہوئے واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا کہ ”پھر ٹھیک ہے، مجھے مت بتائیں۔ میں خود اُس کا پتہ لگا لوں گا۔“

جب وہ واپس جا رہا تھا تو وہ ناک کے ساتھ کوئی بات کرنے کے لیے رُکا۔ ”آپ کی بہت مہربانی کہ آپ نے بہن جی کو اپنے گھر میں رکھا ہے اور آپ کا بیٹا بھی اُس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کر رہا ہے۔ میں اس کو یاد رکھوں گا۔ ہو سکتا ہے یہاں اور بھی ناخوش گوار اور غلیظ حادثے پیش آئیں۔ کیا آپ کے پاس کوئی ریوالور ہے؟ اگر آپ کے پاس ہے تو وہ مجھے دے دیں اور کچھ زیورات بھی۔“ مجھے پتا نہیں تھا کہ خان نے ریوالور کی بابت کیوں پوچھا ہے لیکن شاید وہ ناک کے چند کے بارے کچھ جانا چاہتا تھا۔

بوڑھے آدمی نے جواب دیا۔ ”مجھے خدشہ ہے کہ اس گھر میں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ حملہ آور ہر چیز

لے جا چکے ہیں اور ہم لوٹ مار کے دس دن بعد اس گھر میں واپس آئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو تلاشی کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ خان یہ سن کر قدرے مطمئن ہو گیا۔ اُس نے کہا۔ ”مولوی نے شکایت کی ہے کہ آپ کا بیٹا کانگریس والوں کا آدمی ہے۔ میرا خیال ہے اب مجھے سچائی معلوم ہو چکی ہے۔“

خان جلد ہی وہاں سے چلا گیا اور جب تک مظفر آباد میں رہا وہ بے حد مفید اور مددگار ثابت ہوا۔



## ایک اور شہید

ہمارے کپڑے بوسیدہ اور پھٹے پرانے تھے۔ میری بیٹیاں پیوند لگا کر دھولیتی تھیں لیکن لڑکوں کے پاس کپڑے تبدیل کرنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مجھے کچھ کپڑا ایسا ملا جو میرے شوہر نے کسی وقت خیرات میں دینے کے لیے خریدا تھا۔ میں نے اسے باہر نکالا تا کہ اس سے پا جامے بنائے جائیں۔ خان نے ایک ٹیلر کو بلایا اور اُسے کہا کہ اس کپڑے کی شلواریں بنادے۔ ہندو پا جامہ پہننے کے عادی تھے لیکن اب وہ قبائلیوں کے خوف سے شلواریں پہننے پر مجبور تھے۔ شلوار میں مسلمان سے ہندو کو الگ کرنا ذرا مشکل تھا۔ میں تو ویسے بھی شلوار کے خلاف نہیں تھی لیکن نہیں چاہتی تھی کہ میرے بیٹے زندگی کے لیے اور موت کے خوف سے شلوار پہنیں کیوں کہ اس کے مضمرات بہر حال یہی تھے کہ انہوں نے اپنی مرضی اور رضا کے خلاف منافقانہ طریقے سے ایک ایسے عقیدے کو قبول کر لیا ہے جو ان کا اپنا انتخاب نہیں ہے۔ میں نے ٹیلر کو بتایا کہ وہ پا جامے بنا کر دے۔ جب وہ تیار ہو گئے تو خان نے بل ادا کر دیا۔

میں ایک روز بالکل تنہا اور خالی الذہن بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک خان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں چونکہ استغراق کے عالم میں محو تھی اس لیے مجھے خلل اندازی محسوس ہوئی۔ خان نے پوچھا۔ ”آپ اس قدر اداس کیوں ہیں۔“

”اچھا، میں اپنے شوہر کے بارے سوچے بغیر نہیں رہ سکتی اور میرے پاس ایسی کوئی یادگار بھی نہیں ہے جس کے ذریعے میں اُسے یاد کر سکوں۔“

وہ فوراً وہاں سے چلا گیا اور جلد ہی میرے شوہر کی ایک قمیض جو دھوبی کے پاس تھی لے کر واپس آ گیا۔ میں یہ قمیض دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اُس کا شکریہ ادا کیا۔

بعد میں ایک روز خان میری بالیاں لے کر آ گیا۔ آخر کار اُس نے حسب وعدہ انہیں تلاش کر ہی لیا۔ اُس نے جن کی ماں سے کہا کہ وہ مجھے بالیاں واپس لینے کے لیے قائل کرے۔ میں اس بارے بضد تھی کہ

میں وہ واپس نہیں لوں گی اور بالاصرار خان سے کہا کہ وہ یہ بالیاں اُسی آدمی کو واپس کرے جس سے وہ لے کر آیا ہے۔  
خان بہت ناراض ہوا لیکن غصے کا اظہار کیے بغیر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں  
فی الفور اُس کو واپس کر دوں گا۔“

وہاں سوائے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے اور کوئی کرنے کا کام نہیں تھا اور ایک ایک دن ہماری پوری زندگی کے برابر معلوم ہوتا تھا۔ واحد خبر جس نے معمول کے کاموں کو زیرِ برکر کے رکھ دیا اور ہمیں ایک نئے صدمہ سے دوچار کیا، وہ مسٹر مودی کا انتقال تھا۔ اطلاع کے مطابق اُس کی لاش ایک نالے میں پڑی ہوئی تھی۔ جن نے لاش تلاش کرنے کے لیے ایک گروپ منظم کیا اور بالآخر اُس کو مل گئی۔ مسٹر مودی کی لاش اس نالے میں ہفتوں پڑی رہی لیکن تعجب ہے کہ نہ وہ بوسیدہ ہوئی اور نہ ہی اُس سے بو آنے کی شکایت ملی۔ وہ انہی پرانے کپڑوں میں تھا۔ اُس کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایک معمولی سی حیرت کے آثار تھے لیکن اس کے علاوہ مکمل امن، اطمینان اور خود سپردگی۔ اس خیال سے مایوسی ہوئی کہ انسان زندگی بھر جس توازن اور یکسوئی کی تلاش میں رہتا ہے وہ کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ وقت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ ہم اپنی زندگی میں رونا ہونے والے حوادث کے خلاف دردناک شعور کے ساتھ ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں اور شعلہ بار دانش کی مدد سے اُس کا تجزیہ کرتے ہیں لیکن ہم ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انجام بالآخر عقل و دانش کا محتاج نہیں ہوتا اور نہ ہی دانشوری اور جسمانی نظم و ضبط کا پابند ہوتا ہے۔ جب کبھی ہمیں توازن کا احساس ہوتا ہے یا اس طرح کی کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو یہ کسی مدہم سے سمجھوتے کا نتیجہ ہوتا ہے جہاں انسان کے پاس صرف سکڑی ہوئی اور ناراض خودی رہ جاتی ہے۔

میں نے مسٹر مودی کو بتایا کہ میں وزیر کو خط لکھ رہی ہوں کہ وہ ہمیں چتا کے لیے ایندھن فراہم کرے۔ دوسرے لوگ نہیں چاہتے تھے کہ میں اُسے خط لکھوں۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلمان چتا جلانے کے موقف کو پسند نہیں کریں گے اور اس سے متفق بھی نہیں ہوں گے۔ میرا خیال تھا کہ یہ اقدام اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ ہمیں پتا چل جائے گا کہ وزیر کس حد تک ہماری مدد کے لیے تیار ہے۔ بہر حال اُس نے بہر حال ہمیں پانچ من ایندھن کی منظوری دے دی۔ لیکن ہم اپنے مسلمان ہمسایوں سے خوف زدہ تھے کہ کیا وہ بھی ہمیں اس رسم کی ادائیگی کرنے دیں گے۔ بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ اُس کی لاش کو کشن گنگا میں بہا دیا جائے۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ کیسی قتل ہوا۔ جب حملہ آوروں نے اُس کے بنگلے پر حملہ کیا تو اس کا اکیس سالہ بیٹا گھر کے اندر تھا۔ مسٹر مودی اپنی بیوی مکلا اور دو ملازمین کے ساتھ ایک مشہور ہندو کے ہاں پناہ



لینے شہر گیا ہوا تھا۔ مسٹر مودی کے ساتھ سیکڑوں دیگر لوگوں نے بھی اُسی محل میں پناہ لے رکھی تھی۔ یہ یقین کرنے کے بعد کہ اُس کی بیوی اور بیٹی محفوظ ہیں مسٹر مودی اپنی بدوق لے کر باہر نکل آیا۔

ایک مسلمان جو مظفر آباد کے نزدیک ہی ماکڑی میں رہتا تھا مسٹر مودی کے اس لیے خلاف تھا کہ اُس نے ایک مرتبہ سڑکوں کی تعمیر سے متعلق اُس کا ایک بل پاس نہیں کیا تھا۔ اب کسی طرح موت اُس کو اُسی مسلمان کے دروازے پر لے گئی۔ اس شخص نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر مسٹر مودی کو قتل کیا اور اُس کی لاش کو اُس نالے میں پھینک دیا جہاں سے اب وہ چمن لال کو مل گئی۔ جب مسٹر مودی واپس نہیں آیا تو اُس کے خاندان والوں نے دو تین دن تک اُسی گھر میں رہ کر اُس کا انتظار کیا، جہاں وہ اُنہیں چھوڑ گیا تھا۔ مکان پر بالآخر حملہ آوروں نے حملہ کر ہی دیا اور زیادہ تر مردوں کو پکڑ کر لے گئے۔ جو خواتین وہاں رہ گئی تھیں اُن کے پاس پینے کے لیے پانی تک نہیں تھا اور جب اُن کے بچے پیاس سے بلبلا کر پانی کے لیے چیخنے لگے تو خواتین نے اُن کے درد کو برداشت نہ کرتے ہوئے اُنہیں پینے کے لیے پیشاب دیا۔

اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے پاکستانیوں نے ریاست کی حکومت اور ہندو زمین داروں کی جائیداد کو نیلام کیا۔ چند ہندو جو یہاں باقی رہ گئے تھے بالکل بے اختیار تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کے گھر اور باغات آسانی سے مسلمانوں کو منتقل کر دیے گئے۔

حملہ آوروں نے ہمارے گھر کے سامنے سے اوپر اور نیچے جانے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔ میرے چھوٹے بیٹے ویمل نے اُن سے لڑنے کے لیے بچوں کی ایک فوج کھڑی کی۔ اُس نے دوسرے بچوں کو بتایا کہ تیر اور کمان سے کیسے لڑا جاتا ہے اور جب کبھی وہ حملہ آوروں کے کسی گروپ کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھتا تھا تو وہ کھڑکی سے ہو کر انہیں بے خوفی سے دیکھتا رہتا۔ وہ اپنے ”سپاہیوں“ کو بتاتا تھا کہ انہیں اپنے آپ کو چھپانا نہیں چاہیے کیوں کہ یہ بزدلی کی علامت ہے۔ گھر کے دوسرے افراد ویمل کو چھیڑتے ہوئے کہتے تھے۔ ”جب تک تم زیادہ نہیں کھاؤ گے تو حملہ آوروں کے خلاف کیسے لڑو گے۔ آئیے دیکھیں کہ تم یہ سب روٹیاں کھا سکتے ہو۔“ ویمل اُن کا چیلنج قبول کرتے ہوئے اتنی روٹیاں کھا لیتا تھا جو اُس کی عمر کے لڑکے دو دنوں میں کھاتے ہیں۔ پھر وہ تیزی سے تین گلاس پانی پیتا تھا اور اپنے تئیں ہر ممکن یہ کوشش کرتا تھا کہ وہ ناقابلِ تسخیر دکھائی دے۔

فارسٹ رینجر دوبارہ میرے پاس آیا اور شاید اس مرتبہ وہ مجھے خوفزدہ کرنے آیا تھا کیوں کہ اس مرتبہ اُس کے پاس رائفل اور رائٹنڈز بھی تھے۔ بڑی ہمدردی سے دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ ”مجھے آپ کا افسوس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح آپ کی مدد کروں۔ کیا آپ میرے ساتھ آئیں گی۔ میرے پاس دوسو

راؤنڈز اور ایک سو پچاس روپے بھی ہیں۔ میرے راستے میں کوئی نہیں آ سکتا۔“

میں نے قریب سے ہو کر اُس کے چہرے کا جائزہ لیا جو جنسی جذبات سے لبریز تھا۔ میری غور طلب نگاہ کی وجہ سے وہ کھیانا سا ہو گیا اور اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ میں نے کہا۔ ”میں مجھل فکھ کس ہے کچھ ٹکائی آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی مجھے اس کے بارے سوچنے دیں اور ہو سکتا ہے کہ میں بعد میں کسی وقت آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔“

میں نے یہ جاننے کے لیے کہ اُسے میرا جواب کیسا لگا ہے اُس کی طرف دیکھا لیکن اُس کا سرا بھی تک جھکا ہوا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ جو کچھ میں کرنے جا رہا ہوں وہ آپ کی بھلائی کے لیے ہے۔ آپ آج رات کو میری طرف آرہی ہیں۔ میں ایک بس لے کر آپ کو لے جانے کے لیے آتا ہوں۔“

میں نے انکار کر دیا لیکن وہ میرا موقف سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس نے وعدہ کر لیا کہ وہ رات کو واپس آئے گا۔ جب وہ دُور چلا گیا تو ہندوستانی جہازوں نے دو میل پر بم باری کی۔ مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا، لیکن وہ اُس کے بعد میرے پاس واپس نہیں آیا۔

خان حسب معمول بہت مہربان تھا۔ ایک دن اُس نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ مجھے وہ آدمی مل جائے جس نے مہتا صاحب کو قتل کیا ہے تاکہ اُس کی بیوی اور بچے بھی اسی طرح مصیبت میں مبتلا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اُن کی غمی مجھے کیسے اطمینان دلا سکے گی؟ اس سے میرا درد کم نہیں ہوگا۔ نہیں، میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دوں گی کہ اگر وہ آدمی آپ کو مل بھی جائے تو آپ اُسے قتل کر دیں۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس سب کا قصور وار صرف اُسی کو ٹھہرانا درست نہیں ہوگا۔“